عالمی تہذیب و ثقافت پر
اسلام کے اثرات
تالیف
محمود علی شرقاوی
ترجمہ
صہیب عالم
نجم السحر ثاقب
www.KitaboSunnat.com
مکتبہ قاسم العلوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشر واشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشرواشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

عالمی تہذیب وثقافت پر

اسلام کے اثرات

عالمی تہذیب وثقافت پر

اسلام کے اثرات

محمود علی شرقاوی

ترجمہ

صہیب عالم

نجم السحر ثاقب

مکتبہ قاسم العلوم

نام کتاب ——————— عالمی تہذیب وثقافت پر اسلام کے اثرات
مصنف ——————— محمود علی شرقاوی
ترجمہ ——————— صہیب عالم۔ نجم السحر ثاقب
اہتمام ——————— ملک اسد علی قاسمی
مطبع ——————— گنج شکر پریس
ناشر ——————— مکتبہ قاسم العلوم

ملک اینڈ کمپنی
رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور، پاکستان
042-37231119 , 0321-4021415

فہرست

دیباچہ

اسلام مکمل اور ہمہ گیر مذہب ہے۔ یہ ایک ایسا نظام کامل ہے جو دینی ودنیاوی دونوں معاملات کے تمام پہلوؤں سے بحث کرتا ہے۔ خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اس دین کو لے کر آئے، اسے عام کیا۔ اس کے بعد سلف صالحین اور ائمہ مجتہدین نے اس کی دعوت دی چنانچہ وہ لوگ تزکیۂ نفس میں کامیاب ہوئے اور حیات انسانی کی حتی الامکان اصلاح کی۔

بحیثیت دین اسلام پورے عالم میں پھیل گیا اور بحیثیت سلطنت اسے غلبہ حاصل ہوا۔ دنیا کے بڑے حصے پر اس کی حکمرانی قائم ہوگئی، یہاں تک کہ اس کے حدود مشرق میں چین اور مغرب میں بحر اٹلانٹک تک جا پہنچے۔

عرب کے مسلم حکمرانوں نے اسلام کو دنیا کے دوسرے ممالک جیسے انڈونیشا، چین، فلپائن اور وسط افریقہ کے کچھ حصوں تک پہنچا دیا۔

زبان و بیان، عادات واطوار، روایات اور رسوم ورواج کے اختلاف کے باوجود بہت سی قومیں اسلامی حکومت میں ضم ہوگئیں اور اسی کے پرچم تلے اکٹھا ہوگئیں۔

عرب ایک ایسی بے نظیر قوت وسطوت کے مالک تھے جس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ وہ تعصبات سے پاک تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مفتوحہ قوموں کے ساتھ ان کا اختلاط ممکن

ہوسکا۔ ہمیں ان کی ان فطری خوبیوں کو اپنے ذہن میں رکھنا چاہیئے جن کی بنا پر انھوں نے اپنی عقلی صلاحیتوں کا استعمال کیا۔[1]

عرب ایک اعلیٰ ادب کے بھی حامل تھے جس کی نمائندگی ان کے اشعار کرتے ہیں۔ ان کے اشعار نہ صرف حکمت، خیالات، نفس کی پاکیزگی، روح کی قوت اور حسن اخلاق سے لبریز ہیں البتہ ان کی شاعری کا بڑا حصہ بہادری اور شجاعت پر مشتمل ہے۔ مفتوحہ اقوام کی تہذیب وثقافت سے اختلاط کے بعد ہم عربوں کے اندر دوسروں کی ثقافت کو جاننے کی شدید خواہش کا بھی پتہ لگا سکتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ عرب نظام حکومت میں تعلیم سلطنت کی اہم بنیاد بن گئی۔

پروفیسر ہوکنگ (Hawking) اپنی کتاب میں عالمی سیاست کے اصول پر گفتگو کرتے ہوئے عربی تہذیب کے مستقبل کے متعلق کہتے ہیں کہ: ''علم سے شغف اور اس کے سرچشمے سے سیراب ہونے کی دائمی تڑپ وہ صفات حمیدہ ہیں جن سے عرب متصف تھے۔ یہ صفات عرب کی عبقری شخصیات میں حدکمال کو پہنچی ہوئی تھیں۔ وہ آزادی کے عاشق تھے اور بغیر کسی تعصب کے تمام اچھی چیزوں کو قبول کرنے پر یقین رکھتے تھے۔''

البرشامدور اپنی کتاب ''حمراء غرناطہ'' میں کہتا ہے کہ عرب بے آب وگیاہ صحرا میں زندہ رہے جس کی ریت کو سورج نے آگ کی طرح گرم کر رکھا تھا۔ انھوں نے ستاروں کو راہ نما اور علم کو مرشد بنایا۔ وہ سو سال سے بھی کم مدت میں دنیا جہان کے علم کو اکٹھا کرنے میں اس طرح کامیاب ہوگئے، جس طرح انھوں نے اس سے بھی کم عرصہ میں آدھی دنیا فتح کرلی تھی۔ عرب

---

[1] ل۔ سیدیو (Luis Sidio)، تاریخ العرب العام، ج ۲، ص ۳-۴

ہمارے لیے حمراء غرناطہ میں علوم وفنون، عزوافتخار اور مجد وشرف کے بہترین آثار چھوڑ گئے۔

ان فتوحات کی وجہ سے ہی مسلمان نہ صرف یونانی فلسفہ کے وارث ہوئے بلکہ ایران، ہندوستان، چین اور خالص عربی ثقافت سے بھی مستفید ہوئے۔ انہوں نے مختلف تہذیب وثقافت کو قبول کرنے میں کشادہ ظرفی کا ثبوت دیا، ان کی نگرانی وحفاظت، تصحیح وتزئین اور ان پر بحث وتحقیق میں بھرپور حصہ لیا اور بہت سے جدید افکار ونظریات کا اضافہ بھی کیا، یہاں تک کہ عربی تہذیب اپنے کمال تک جا پہونچی اور سابقہ تہذیبوں میں اپنا منفرد مقام بنانے میں کامیاب ہوگئی۔

اسلامی تہذیب نے سابقہ تہذیبوں کی نہ اہمیت کم کی نہ اسے کم تر نگاہوں سے دیکھا بلکہ اسے فائدہ پہنچایا، کیونکہ علوم وافکار، ہوا اور پانی کی مانند ہوتے ہیں۔ ان کے نتائج کسی خاص خطے اور علاقے میں محدود نہیں رہتے۔ ان پر کسی ایک شخص کا قبضہ نہیں رہتا۔ اعلی افکار اور بلند وبالا خیالات پھیلے بغیر نہیں رہ سکتے، جیسے تاریکی میں روشنی، جہاں جہاں فروکش ہوتی ہے جہالت کی تاریکیوں کا سینہ چیر دیتی ہے۔

اسلامی تہذیب نے ہی یورپی نشأۃ ثانیہ کی راہیں ہموار کی۔ یورپ کی تہذیب نے اسی سے روشنی مستعار لی۔ اس تہذیب نے اپنے استحکام وتوسیع کے بعد اتنی حیرت انگیز ترقی کی جس کا تصور عقل انسانی نہیں کر سکتی تھی۔

یہ فطری تھا کہ امت مسلمہ ہر میدان میں ترقی کرتی اور اپنی عظمت وشوکت کا پرچم لہراتی خصوصا علم وثقافت کے میدان میں۔ کیوں کہ شریعت اسلامی کی بنیاد ہی علم وتعلم پر ہے۔ خود قرآن کی ابتدائی آیات علم وتعلم کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ اسی وقت سے امت مسلمہ دینی تعلیمات اور اس کے احکام سے چمٹی رہی اور ان ہی ارشادات وہدایات کی روشنی میں اپنے

راستوں کا تعین کرتی رہی۔

جدید دور میں ۱۹۴۹ء میں ہیگ (Hague) اور ۱۹۵۱ء میں پیرس میں بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد کی گئیں، جس میں شریعت اسلامی کے بعض احکام اور اس کے نظریات پر بحث کی گئی۔ کانفرنس کے شرکاء نے یہ فیصلہ کیا کہ شریعت اسلامیہ عام قانون سازی کے مقابلے میں سر سبز وشاداب اور زرخیز منبع ومصدر بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ ایک زندہ شریعت ہے، جس کے اندر ارتقاء کی پوری صلاحیت موجود ہے۔

ہمیں پورا یقین ہے کہ متعدد خصوصیات اور مختلف الآراء ہونے کے باوجود فقہ اسلامی کے احکام تمام چیزوں کو محیط ہیں۔ عصر حاضر میں فقہا نے عملی زندگی کا سامنا کرنے کے لئے نہ صرف بے انتہا کوششیں کیں بلکہ ایک ایسے وقت میں، جب ہم تہذیبی پس ماندگی کا شکار تھے، شریعت اسلامی کی رُوح اور اس کے مضبوط و مستحکم بنیادوں کی روشنی میں، اس پر از سرنو غور بھی کیا۔ انہوں نے اس میدان میں ہمیں رہ نمائی کے قابل بھی بنایا اور کینہ پرور نیز منکرین کو اسلام کی اس خوبی کے اعتراف پر مجبور بھی کیا کہ وہ اپنے اندر ارتقاء کا ایک ہمہ گیر نظام رکھتا ہے جو نہ صرف کون ومکاں میں پائے جانے والے ان اسرار ومعارف کی تحقیق وتفتیش پر ابھارتا ہے، جن کا ادراک عقل کے لیے ممکن ہو بلکہ علوم ومعارف کی ان چیزوں کو اپنانے کی ترغیب بھی دیتا ہے جو انسانیت کے لئے مفید ہو سکتی ہیں۔

آج جتنی ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی تہذیب کا مطالعہ کریں، اس سے کہیں زیادہ ناگزیر یہ ہے کہ ہم اس کے اصول ومبادی کو پہچانیں۔ اس تہذیب کے سرچشمے میں پوشیدہ جن خزینوں پر گردشِ ایام نے تہہ دار گرد ڈال دی ہے، اس کی بازیافت کریں۔ ہمارے لئے محض یہ کافی نہیں کہ اپنے شاندار ماضی پر فخر کریں بلکہ اس کی نشأۃ ثانیہ کے لئے اپنے آپ کو

عملی طور پر تیار بھی کریں۔اپنے آپ کو بیدار کرنے اور موجودہ زندگی میں اہم اور کلیدی کردار ادا کرنے کی کوششیں کریں۔

عالم اسلام کو چاہیے کہ وہ اپنا تاریخی محاسبہ کرے اور اپنی شناخت کے تحفظ کی خاطر موجودہ سیاسی، معاشی اور تہذیبی تصادم میں اپنے جوہر حقیقی کا پتہ لگائے۔آئندہ صفحات میں ہم اپنے انھیں عظیم الشان کارناموں کا مطالعہ کریں گے تاکہ ہم گہرائی کے ساتھ غور وفکر کریں، اپنی زندگیوں میں اسلام کو واپس لا سکیں اور اس انسانی تہذیب کو دوبارہ قائم کر سکیں جو عرصہ سے تاریکیوں میں گم ہے۔

اللہ سے دعا گو ہوں کہ ہمیں ہمیشہ بہتر کام کی توفیق عطا کرے۔سیدھے راستے پر چلائے۔اس امت کے اخلاف کو اسلاف کی سیرت پر قائم رکھے۔قرآن مجید نے ہی اس امت کی اصلاح کی تھی اور آج بھی فلاح و کامرانی اور ارتقاء و کامیابی کا انحصار اسی کتاب کو مضبوطی کے ساتھ پکڑنے میں ہے، انسانیت کی خوشی، اور خوش نصیبی بھی اسی پرچم کی محتاج ہے۔

والله ولي التوفيق

محمود علی شرقاوی

اسلام میں علم کی اہمیت

اسلام نے حصول علم کی دعوت دی ہے اور لوگوں کو اس سے آراستہ ہونے کی ترغیب دی ہے۔ نبی ﷺ کو ﴿وقل رب زدنی علما﴾ (طٰہٰ:۱۱۴) "اور دعا کرتے رہو کہ اے میرے رب! میرے علم میں افزونی فرما!" دعا مانگنے کا حکم دے کر تحصیل علم پر زور دیا گیا ہے۔

آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ﴿شهد الله أنه لا اله الا هو والملائكة وأولو العلم قائماً بالقسط﴾ (آل عمران:۱۸) "اللہ، فرشتوں اور اہل علم کی گواہی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ عدل وقسط کا قائم رکھنے والا ہے"۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اپنی ذات کا ذکر کیا پھر فرشتوں کا اور ان کے بعد اہل علم کا۔ یہ چیز علم کی اہمیت وفضیلت اور مقام و مرتبہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ﴿قل هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون﴾ (الزمر:۹) "پوچھو کیا علم وبصیرت رکھنے والے اور وہ جو علم وبصیرت نہیں رکھتے، دونوں برابر ہوں گے؟" سب سے پہلی وحی جو رسول ﷺ پر نازل کی گئی اور جس کا آغاز اللہ نے اپنی ربوبیت کے ذکر سے کیا ہے وہ ﴿أقرأ باسم ربك الذى خلق۔ خلق الانسان من علق۔ اقرأ وربك الاكرم۔ الذى علم بالقلم۔ علم الانسان ما لم يعلم﴾ (سورۂ العلق، ۱-۵) "پڑھ اپنے اس خداوند کے نام سے جس نے پیدا کیا، پیدا کیا انسان کو خون تھکے سے،

پڑھ اور تیرا رب بڑا ہی کریم ہے، جس نے تعلیم دی قلم کے واسطے سے، اس نے سکھایا انسان کو وہ کچھ جو وہ نہیں جانتا تھا'' ہے۔ اس میں رب العزت نے قرأت یعنی حصول علم اور علم وعرفان کے راستوں سے واقف ہونے کا حکم دیا ہے، پھر اللہ رب العزت یہ ہدایت بھی دے رہا ہے کہ رب کا نام لے کر تحصیل علم میں اس سے مدد طلب کی جائے جو تمام مخلوق کی پرورش بھی کرتا ہے اور ان کو مختلف النوع وسائل بھی فراہم کرتا ہے۔ اپنے رب سے مدد طلبی کا یہ حکم اس لیے دیا گیا ہے تاکہ انسان علم کی اہمیت اور مقام ومرتبہ کو محسوس کرے اور یہ جان لے کہ تحصیل علم کا کام عظیم الشان بھی ہے اور خطرات سے پر بھی۔ اس کے بعد اللہ تعالی بندوں کی تخلیق وتکوین کا ذکر کرتا ہے اور پھر اسے علم کی نعمت سے بہرہ ور کرتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے ﴿الذی علم بالقلم ۔ علم الانسان ما لم یعلم﴾، ان آیات میں انسان کو پیدا کرنے اور اسے علم عطا کرنے کی نعمتوں کو برابر کا درجہ دیا گیا ہے۔ یہ بات جہاں اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ جاہل اور ان پڑھ لوگوں کا اس دنیا میں ہونا اور نہ ہونا یکساں ہے۔ وہیں علم کی اہمیت اور معرفت وآگہی میں انسان کے مقام ومرتبہ کو بھی سراہتی ہے، چنانچہ اللہ تعالی نے اپنے رسول ﷺ کو ان کی قوم کی طرف سے لگائی گئی ایک شدید تہمت یعنی جنون اور پاگل پن سے بری قرار دیتے ہوئے قلم کی قسم کھائی ہے۔ ﴿ن و القلم وما یسطرون۔ وما أنت بنعمة ربك بمجنون﴾۔ (سورۃ القلم:۱-۳)

''یہ سورۂ ن ہے، قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جو وہ لکھتے ہیں! کہ تم اپنے رب کے فضل سے کوئی دیوانے نہیں ہو''۔

علم، بصارت اور بصیرت دونوں کا نور ہے۔ جہالت تاریکی بلکہ اندھا پن ہے۔ اللہ تعالی فرماتا ہے کہ ﴿افمن یعلم أنما أنزل الیك من ربك الحق کمن هو أعمی، انما یتذکر أولو الالباب﴾ (الرعد:۱۹)، علم ہی وہ بنیاد ہے جس کے سبب انسان کو اس دنیا میں

دوسری تمام مخلوقات کے مقابلے میں اللہ کی خلافت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ﴿واذ قال ربك للملائكة انی جاعل فی الارض خليفة۔ قالوا أتجعل فيها من يفسد فيها ويسفك الدماء ونحن نسبح بحمدك ونقدس لك۔ قال انی أعلم ما لا تعلمون۔ وعلم آدم الاسماء كلها ثم عرضها على الملائكة فقال أنبئونی بأسماء هولاء ان كنتم صادقين۔ قالوا سبحانك لا علم لنا الا ما علمتنا انك أنت العليم الحكيم۔ قال يا آدم أنبئهم بأسمائهم فلما أنبأهم بأسمائهم قال ألم أقل لكم انی أعلم غيب السموات والأرض وأعلم ما تبدون وما كنتم تكتمون﴾ (سورۃ البقرۃ: ۳۰-۳۳)

''اور (یاد کرو) جب کہ تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ انھوں نے کہا: کیا تو اس میں اس کو خلیفہ مقرر کرے گا جو اس میں فساد مچائے اور خونریزی کرے، اور ہم تو تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہی ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہی ہیں؟ اس نے کہا: میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور اس نے سکھا دیے آدم کو سارے نام۔ پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان لوگوں کے ناموں سے آگاہ کرو۔ انھوں نے کہا کہ تو پاک ہے۔ ہمیں تو تو نے جو کچھ بتایا ہے اس کے سوا کوئی علم نہیں۔ بے شک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے، کہا: اے آدم! ان کو بتاؤ ان لوگوں کے نام۔ تو جب اس نے بتائے ان کو ان لوگوں کے نام تو اس نے کہا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا کہ آسمانوں اور زمین کے بھید کو میں ہی جانتا ہوں اور میں جانتا ہوں اس چیز کو جس کو تم ظاہر کرتے ہو اور جس کو تم چھپاتے تھے۔''

ان آیات سے فرشتوں پر واضح ہوتا ہے کہ انسان کو کن حکمتوں اور مصلحتوں کے پیش نظر زمین پر خلیفہ مقرر کیا گیا ہے چناں چہ وہ انسان کی عظمت اور بلندی کا اعتراف کر لیتے ہیں۔

احادیث رسول بھی اہل علم کے بلند مقام و مرتبہ کے ذکر سے بھری پڑی ہیں۔

چناں چہ آپ نے فرمایا کہ (اس زمین پر علماء کی وہی حیثیت ہے جو آسمان پر ستاروں کی ہے۔ بحر و بر کی تاریکیوں میں ان سے رہ نمائی ملتی ہے۔ ستارے غروب ہو جائیں تو سیدھے راستے پر چلتے ہوئے لوگ بھی گمراہ ہو سکتے ہیں)۔ دوسری جگہ آپ نے فرمایا کہ (جو شخص حصول علم کی خاطر نکلتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے اور فرشتے طالب علموں کی کارکردگی سے خوش ہو کر ان کی خدمت میں اپنے پر بچھا دیتے ہیں اور طالب علموں کی مغفرت کے لیے زمین و آسمان کی ہر چیز، یہاں تک کہ سمندروں میں (موجود) مچھلیاں بھی دعا کرتی ہیں اور ایک عالم کو ایک عابد پر وہی فضیلت حاصل ہے جو چاند کو تمام ستاروں پر۔ علما ہی انبیاء کے حقیقی وارث ہیں، انبیاء نے ورثے میں درہم و دینار نہیں بلکہ علم چھوڑا ہے لہذا جسے یہ علم حاصل ہو جائے، اسے بہت بڑی بڑی نعمت حاصل ہو گئی)۔ (ترمذی، ابن ماجہ، ابوداؤد، دارمی، ابن حنبل)

یہاں علم سے مراد صرف حرام و حلال یعنی احکام شرعیہ کا علم نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ان چیزوں سے واقفیت ہے جن کے ذریعہ انسان اپنے ان فرائض اور ذمہ داریوں کو کماحقہ پورا کر سکے، جس کے لئے اسے زمین کا خلیفہ بنایا گیا ہے یعنی زمین کی تعمیر، اس کے خزانوں کی دریافت اور اس میں چھپے ہوئے اسرار و رموز کا انکشاف۔

اس میں وہ علم بھی شامل ہے جو نباتات اور پیڑ پودوں کی ترقی و نشو و نما میں مددگار ہو اور زمین کی بہتر پیداوار نیز اس کی زرخیزی میں معاونت کرے۔ قرآن اس علم کی طرف بھی دعوت دیتا ہے جس کے ذریعہ حیوانات اور جانوروں کی بہتری ہو سکے، انھیں انسان کی خدمت کے لیے مسخر کیا جا سکے اور ان سے پوری طرح فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اس علم کا حصول بھی ضروری ہے جس کے ذریعہ جائز طریقوں سے کسب معاش اور دولت کا حصول ممکن ہو اور اسے اس

انداز سے صرف کیا جائے جس سے اس کے وسائل اور مصارف کو منظم اور مربوط کیا جا سکے۔

اس میں اس علم کی تحصیل بھی شامل ہے جس کے ذریعہ انسان مختلف امراض اور بیماریوں سے نجات حاصل کرتا ہے، علاج و معالجہ کے مختلف طریقوں سے ان بیماریوں کا دفاع کرتا ہے، یعنی وہ علم جو انسان کی صحت و عافیت کی بحالی کے لیے ضروری ہو۔ اسی طرح امن و سلامتی کے قیام کے لیے بھی اس علم کا حصول ضروری ہے جس کے ذریعہ تکلیفوں اور پریشانیوں کا ازالہ ممکن ہو سکے اور امن و سلامتی کے ساتھ کھلواڑ کرنے والے عناصر پر قابو پایا جا سکے، یہ اور اس طرح کے وہ تمام علوم جو انسانیت کے لیے مفید اور نفع بخش ثابت ہوں، قرآن کریم اور سنت نبوی ﷺ کی رو سے ہر انسان کو حاصل کرنا چاہیئے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام کی نظر میں علم کو انسانی زندگی کے تمام عناصر میں اولین عنصر کی حیثیت حاصل ہے۔ اسی بنا پر بعض مفسرین نے عمل صالح سے وہ عمل مراد لیا ہے جس کی بنیاد علم پر ہو، نہ کہ وہم و گمان پر۔

چناں چہ شیخ محمد عبدہؒ اس آیت کریمہ ﴿يؤتي الحكمة من يشاء ومن يؤت الحكمة فقد أوتي خيراً كثيرا﴾ (سورۃ البقرۃ:۲۶۹) ''وہ جس کو چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے اور جسے حکمت ملی اسے خیر کثیر کا خزانہ ملا۔'' کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ

> یہاں حکمت سے مراد وہ علم ہے جو صحیح ہو، جس کی وجہ سے نفس میں استحکام اور عزم و ارادہ میں پختگی آتی ہو اور جس عمل کی بنیاد علم صحیح پر ہو گی وہی عمل موجب سعادت بھی ہو گا۔ کچھ لوگ مختلف نوع کی معلومات حاصل کر کے اپنے دماغ میں محفوظ کر لیتے ہیں تا کہ مخصوص اوقات میں اسے پیش کر سکیں۔ لیکن اس قسم کی معلومات حقیقت اور توہم میں امتیاز کرتے وقت مفید ثابت نہیں ہوتیں کیونکہ ان کے دل میں وہ اس طرح محکم نہیں ہوتیں کہ اپنے عزم و ارادہ کے وقت انہیں کام میں لا سکیں۔ بس وہ چند تصورات

> اور خیالات ہوتے ہیں جو عمل کے وقت غائب ہو جاتے ہیں اور بحث ومباحثہ کے وقت حاضر رہتے ہیں۔
>
> وہ جس کو چاہتا ہے اپنی حکمت سے نوازتا ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے مکمل عقل عطا کرتا ہے اور ساتھ ہی صحیح علم کے حصول کے لیے عقل کو صحیح طریقے سے استعمال کرنے کی توفیق بھی عطا کرتا ہے۔
>
> اللہ تعالی نے حکمت کے ساتھ دوسری بہت سی بھلائیوں کو بھی ایک کڑی میں منسلک کر رکھا ہے۔ چنانچہ حکمت ہی وہ چیز ہے جو عمل نافع اور کار خیر پر ابھارتا اور آمادہ کرتا ہے۔ حکمت کا ذریعہ عقل سلیم ہے جو علمی مسائل میں استحکام اور پختگی بخشتا ہے، عقل جب بھی فیصلہ کرتی ہے مدلل اور پختہ فیصلہ کرتی ہے اور اسے نافذ بھی کرتی ہے۔
>
> چناں چہ ہر حکیم صاحب علم وعمل اور بھلائیوں کا مخزن ہوتا ہے لہذا اللہ تعالی نے فرمایا کہ "وما يذكر الا اولو الألباب" (البقرة:٢٦٩) 'مگر یاددہانی وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں' یہ اللہ کی سنت ہے کہ شکوک وشبہات سے پاک عقل والے ہی علم سے نصیحت حاصل کرتے ہیں اور عمل کے لئے اسی کے ذریعہ اپنے آپ کو مہمیز کرتے ہیں''۔[1]

ابتدا میں مسلمانوں نے قرآن کریم کے اس اشارے کی روح کو سمجھ کر علم کی قدر و قیمت کا اندازہ کرلیا اور افراد واقوام کی سعادت وخوش بختی میں اس کی اہمیت وضرورت کو اچھی طرح پہچانا، حالانکہ اس سے پہلے وہ بالکل ''امی'' یعنی ان پڑھ تھے۔ بلاذری اپنی کتاب ''فتوح البلدان'' میں لکھتا ہے کہ جب قریش میں اسلام کی آمد ہوئی تو صرف سترہ آدمی لکھنا جانتے تھے۔ ان میں عمرؓ بن الخطاب، علیؓ بن ابی طالب اور عثمانؓ بن عفان وغیرہ

---

[1]- محمد عبدہ، تفسیر المنار، ج۳، ص۳۵

شامل تھے۔ جب قبیلہ قریش کا ہی یہ حال تھا کہ اس میں صرف سترہ لوگ ہی لکھنا جانتے تھے تو دوسرے قبیلوں کی صورت حال کیا ہوگی! لکھنے پڑھنے کی اسی اہمیت کی بنا پر کتابت اور تیر چلانے میں ماہر لوگوں کو کامل کہا جاتا تھا جیسے سعد بن ابی عبادہؓ۔

ناخواندگی کو مٹانے کے لئے مسلمانوں نے تمام وسائل کا استعمال کیا۔ اس کے ازالے کے لیے اسلامی معاشرے میں پہلا قانون غزوہ بدر کے بعد لایا گیا۔ وہ اس طرح کہ مسلمانوں نے اس جنگ میں ستر لوگوں کو قید کیا تھا جن کی رہائی فدیہ (مقررہ مال) ادا کرنے کے بعد ممکن تھی۔ فدیہ نہ ادا کر پانے والا اگر لکھنا پڑھنا جانتا تو وہ دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتا اور آزاد کر دیا جاتا۔

اللہ کے رسولؐ نے صحابہ کو دوسری زبانوں کو جاننے کی بھی ترغیب دی۔ حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر میں ایک قوم کی طرف کچھ لکھ کر بھیجوں تو مجھے ڈر ہے کہ وہ اس میں کمی یا زیادتی نہ کر دیں چناں چہ تم سریانی زبان سیکھ لو۔[1] اس کے بعد حضرت زیدؓ نے سترہ دن میں سریانی زبان سیکھ لی۔

اللہ کے رسولؐ نے پڑھنے پڑھانے کو صرف مردوں کے لیے ہی خاص نہیں کیا بلکہ آپ چاہتے تھے کہ عورتیں بھی اس میں بھرپور حصہ لیں۔ حضرت ابو سعدؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک عورت آپ کے پاس آئی اور کہا اے اللہ کے رسولؐ مردوں نے آپ سے حدیثیں حاصل کیں، آپ ہمارے لیے بھی ایک دن مقرر کر دیں، جس میں ہم آپ کے پاس آجایا کریں اور آپ ہمیں کچھ سکھا دیا کریں تو آپؐ نے فرمایا کہ فلاں فلاں دن ایک جگہ جمع ہو جایا کرو۔ اس طرح آپ ان کے پاس آتے اور انھیں کچھ سکھا دیا کرتے۔

بلاذری نے اپنی کتاب فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ شفاء عدویہ جو بنی عدی کی سردار

بھی تھیں، عہد جاہلیت میں لکھنا جانتی تھیں اور عورتوں کو پڑھنا لکھنا سکھاتی تھیں۔ حضرت عمرؓ کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت میں آنے سے پہلے شفاء سے پڑھنا لکھنا سیکھا کرتی تھیں۔ جب وہ آپ کی زوجیت میں آئیں تو آپ نے شفاء عدویہ سے درخواست کی کہ ان کی تعلیم جاری رکھیں اور جس طرح لکھنا سکھایا ہے اسی طرح خوش خطی بھی سکھا دیں۔ واقدی نے روایت کیا ہے کہ آپ کی بیویوں میں حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ نے پڑھنا لکھنا سیکھا اور دوسروں کو بھی پڑھایا۔ عہد نبوی کے بعد بھی بہت سی مثالیں ہیں کہ عہد بنی امیہ سے لے کر آج تک عرب خواتین کے لیے مختلف علوم وفنون اور ثقافتوں کو جاننے کے دروازے ہمیشہ کھلے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی باصلاحیت عرب خواتین ابھر کر سامنے آئیں اور قرآن، حدیث، فقہ، لغت نیز دیگر علوم وفنون اور معارف میں نمایاں مقام حاصل کیا، یہی نہیں بلکہ ان کے حلقۂ درس سے مستفید ہو کر بڑی بڑی مسلم شخصیتیں بھی سامنے آئیں، چناں چہ ابن خلکان نے ذکر کیا ہے کہ سیدہ نفیسہ بنت حسین بن زید بن حسنؓ بن علیؓ بن ابی طالب کی مصر میں علمی مجلس سجا کرتی تھی جس میں امام شافعی بنفس نفیس حاضر ہوئے اور ان سے حدیث پڑھی۔ ابوحیان نے اپنے اساتذہ میں تین خواتین کا بھی ذکر کیا ہے جن کے نام یہ ہیں: مونسہ ایوبیہ بنت الملک عادل (صلاح الدین ایوبی کا بھائی)، شامیہ تیمیہ اور زینب بنت صباح عبداللطیف بغدادی جو مشہور مورخ ہیں۔

اسلام نے دیگر حقوق کے ساتھ تعلیمی اور ثقافتی حقوق میں بھی تمام لوگوں کے تئیں یکساں اور مساوی رویہ اپنایا ہے، شریف ورذیل، امیر وغریب، شناسا وغیر شناسا، مسلم وغیر مسلم اور مرد وزن کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی ہے۔ اسلامی عدالت کے پیمانے میں سب یکساں ہیں۔

اسلامی ریاست میں خواندگی کی تحریک شروع ہوئی اور پھر اس کے مراکز مساجد سے مکاتب، مکاتب سے مدارس اور مدارس سے جامعات میں منتقل ہوتے چلے گئے۔ان مراکز سے بہت سی عظیم شخصیات اور علماء نے فراغت حاصل کی۔اور پھر ان سے بہت سے علما، فقہا اور مفکرین نے علم حاصل کیا۔

مکہ کی درس گاہ سے جو علما سامنے آئے ان میں، صحابہ میں سے معاذؓ بن جبل، عبداللہؓ بن عباسؓ ہیں، تابعین میں سے، مجاہد، ابن جبیر، عطاء بن ابی رباح اور طاؤس بن کیسان ہیں اور بعد کے علماء میں امام شافعی کا نام بھی مکہ کے علما میں شامل ہے۔

مدینہ میں صحابہ نے آپ ﷺ سے دینی علوم حاصل کیے، انھوں نے آپ کی درس گاہ سے فراغت حاصل کی، اس درس گاہ سے علم حاصل کرنے والے صحابہ میں علیؓ بن ابو طالب، زیدؓ بن ثابت، عبداللہؓ بن عمرؓ، عبداللہؓ بن مسعودؓ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ان میں سے بعض علماء دوسرے علاقوں کی طرف منتقل ہو گئے تا کہ دینی معاملات میں لوگوں کی رہنمائی کر سکیں، انھوں نے مساجد میں اپنی علمی مجالس قائم کیں۔مختلف ممالک میں علمی تحریک کی بنیاد رکھی۔[1]

اسلام کے آغاز میں صرف دینی اور شرعی علوم ہی مسلمانوں کی توجہ کا مرکز بن سکے لیکن اموی سلطنت کے قیام کے ساتھ ہی دوسرے علوم یعنی علوم عقلیہ ونقلیہ کی طرف بھی توجہ دی گئی۔عباسی دور میں علمی و تعلیمی تحریک ان دونوں میدانوں میں اپنی بلندی کو پہونچ گئی۔

---

[1]- ابن الاثیر، اسد الغابۃ، ج۲، ص۲۷۹

اسلامی حکومت میں علمی مراکز

مساجد:

اسلام میں مسجد کو اولین مدرسہ کی حیثیت حاصل تھی۔ عبادت کے ساتھ مساجد میں درس وتدریس کے حلقے بھی قائم ہوا کرتے تھے۔ مسجد نبوی، مدینے میں زندگی سے بھرپور ایک دھڑکتا ہوا دل ہی نہیں، سماجی فلاح و بہبود کا مرکز بھی تھی[1] اور اصحاب رائے اور اہل شوریٰ کے اکٹھا ہونے کی جگہ بھی۔ یہیں سے حکومت کی سرگرمیاں چلتی تھیں اور اس کے متعدد امور انجام پاتے تھے۔ ابن تیمیہ اس مسجد کے بارے میں کہتے ہیں: ''نبیؐ نے اس کی بنیاد تقوی پر رکھی تھی، اس مسجد میں نماز، قرأت، قرآن، ذکر الٰہی، خطابت اور دیگر علوم سکھائے جاتے تھے۔ اس میں سیاسی مسائل بھی حل ہوتے اور جنگوں کے علم بھی تیار کیے جاتے تھے، امراء و افسران کا تقرر یہیں سے کیا جاتا تھا اور جب دین یا دنیا کا کوئی اہم مسئلہ مسلمانوں کو درپیش ہوتا تو وہ اسے حل کرنے کے لیے یہیں اکٹھا ہوتے تھے۔[2]

1- احمد بن ابراہیم الجزار، جن کا شمار عظیم مسلم اطباء میں ہوتا ہے، یہ قیروان کے رہنے والے تھے، کے سوانحی تذکرے میں اس واقعہ کا ذکر ملتا ہے کہ وہ عشاء کی نماز کے بعد نکلتے اور غریب و مسکین مریضوں کے علاج کے لئے مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو جاتے۔ ان کے ساتھ ایک غلام ہوتا جو مختلف اقسام کی دوائیں لیے رہتا۔ جزار اس میں سے مناسب حال دوا دیتے۔ وہ یہ کام محض رضائے الٰہی اور امت محمدیہ کی بھلائی کی خاطر کرتے۔ صالح اطباء کی ایک کثیر تعداد تھی جو اس قسم کا رفاہی کام کرتی۔ (ڈاکٹر حسین مونس: المساجد، کویت، ربیع الاول ۱۴۰۱ھ، ص۴)

2- اعلی عبدالحلیم محمود، المسجد واثرہ فی المجتمع الاسلامی، ص۳۳

اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ اسلام کے پہلے استاذ تھے آپ مسجد نبوی میں درس و تدریس کا فریضہ انجام دیا کرتے تھے۔ خلفائے راشدین کے عہد تک مسجدِ نبوی کو درسگاہ کی حیثیت حاصل رہی۔ استاذ مسجد کے کسی گوشہ میں بیٹھ جاتا اور اس کے اردگرد طلبہ کے حلقے جمع ہوجاتے۔ طالب علم اپنے استاذ یا شیخ کے حلقہ میں حاضر ہوتا اور جب استاذ کی تعلیم مکمل ہوجاتی اور طالب علم انھیں اچھی طرح یاد کرلیتا تو اسے درس وتدریس کی اجازت دے دی جاتی اور وہ ایک الگ حلقہ قائم کرکے تدریس کی خدمت انجام دینے لگتا۔[1]

جو علما مساجد میں درس دیا کرتے تھے وہ درس کی کوئی فیس وصول نہیں کرتے تھے۔ ان کا مقصد رب کی خوشنودی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ طلبہ محض حصول علم کی خاطر اپنے وطن اور اعزا واقارب کو چھوڑ کر دور دراز سے ان کے پاس آیا کرتے تھے۔

اموی عہد خلافت میں مسجدیں نہ صرف کشادہ ہونے لگیں بلکہ ان کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا۔ ان مساجد کے حلقے جامع مطالعہ کا عملی نچوڑ ہوا کرتے تھے۔ ان کا اسلوب مناقشہ اور مناظرہ کا تھا۔ قرآن کریم مسلمانوں کے علم کا محور ومرکز تھا۔ اسی درس وتدریس کی وجہ سے علم تفسیر اور علمِ حدیث کے دو ممتاز فن وجود میں آئے اور اسی طرح لغت اور تاریخ کی طرف بھی توجہ ہوگئی۔ اس کے بعد دوسرے عملی علوم کا نمبر آتا ہے۔ اموی عہد میں درس وتدریس کا کام مساجد کے ساتھ ساتھ مکاتب اور مدارس میں بھی ہونے لگا۔

مکاتب:

مکاتب کا آغاز ہوا۔ (عربی میں اس کا واحد کتاب آتا ہے)۔ اس سے مقصود ابتدائی تعلیم، قرآن کریم کا حفظ اور حساب کے مبادی کی تعلیم دینا تھا۔ مسجد کے بعد عالم اسلام میں جن تعلیمی اداروں کی بنیاد پڑی، وہ مکاتب ہی ہیں۔ ان کی ابتداء عہد اموی میں ہوئی۔ ان

[1] احمد امین، ضحیٰ الاسلام، ج ۲ ص ۵۲

میں بچے بچیاں بغیر کسی امتیاز وتفریق کے علم حاصل کرتے تھے۔اس سے یہ بات بھی منکشف ہوتی ہے کہ عورتوں کوتعلیم کا حق ہزاروں سال قبل عرب مسلمانوں نے دیا۔ عالمی تہذیب و ثقافت پر عربوں کا یہ ایک عظیم احسان ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔[1]

یہ مکاتب اسلامی دنیا میں برابر تعلیمی کردارادا کرتے رہے اور موجودہ دور میں بھی اپنا کردارادا کررہے ہیں۔لیکن یہ جان کر آپ کوافسوس ہوگا کہ عالم اسلام کے بیشتر ممالک میں اس صدی کے اندر مکاتب کے نظام کوختم کردیا گیا ہے اور اگر کچھ ممالک میں باقی بھی ہیں تو اس کا نام ''زوایا'' یا ''خلاوی'' رکھ دیا گیا۔[2]

بڑے مدارس:

مکاتب کی ابتدائی تعلیم حاصل کر لینے کے بعد طلبہ قرآنی تعلیم کی تکمیل، زبان وقواعد کی جانکاری اور علم الحساب میں کمال حاصل کرنے کی خاطر مدارس کا رخ کرتے تھے۔ یہ خصوصی مدارس تھے جہاں طلبہ مختلف علوم میں سے کسی ایک میں اختصاص(Specialisation) حاصل کرتے۔

اس قسم کے مدارس کی ابتدا چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں ہوئی۔سب سے پہلے مدرسے کا نام ''المدرسہ الصادریۃ'' تھا، جس کی بنیاد شام میں ۳۵۰ ہجری میں پڑی۔ پانچویں صدی ہجری کے نصف میں مدرسہ صادرہ کے نہج پر کئی دوسرے مدارس بھی قائم ہوئے۔ ان میں قابل ذکر ''مدرسہ بیہقیہ'' اور ''مدرسہ سعدیہ'' ہیں جن کی بنیاد نیشاپور میں پڑی تھی۔[3]

---

[1]- احمد فؤاد الاہوانی، فضل العرب علی الحضارۃ العالمیۃ، توسیعی خطبہ ۵۹-۱۹۵۸ء، ص ۱۲۰

[2]- زوایا: لیبیا میں موجود مکاتب کا نام ہے اور خلاوی سوڈان میں۔

[3]- ناجی معروف: نشأۃ المدارس المستقلۃ فی الاسلام، بغداد، ۱۹۶۶ء، ۵-۴

اس کے بعد بغداد میں ''مدرسہ نظامیہ'' قائم ہوا۔ یہ وہ مشہور مدرسہ تھا جو نمونے کے طور پر قائم کیا گیا۔ اس کے بعد عالم اسلام کے مرکزی شہروں میں مدارس قائم کر کے یہی تعلیمی نظام رائج کیا گیا۔ مدرسہ نظامیہ سلجوقی بادشاہ ''الپ ارسلان'' (متوفی ۴۵۹ ہجری) کے وزیر اعظم نظام الملک طوسی کی طرف منسوب ہے کیوں کہ اس نظام کا موجد وہی تھا۔[1]

بغداد میں ساتویں صدی تک مدارس قائم ہوتے رہے، عباسی خلیفہ مستنصر باللہ نے ۶۲۵ ہجری میں مدرسہ مستنصریہ کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا۔ ۶۵۶ ہجری میں اس طرح کے مدارس کی تعداد صرف بغداد میں ۳۸ تک پہونچ چکی تھی۔[2]

اسلامی ثقافت کے تمام گہواروں میں اس طرح کے مدارس قائم کرنے کا سلسلہ رائج ہو چکا تھا۔ یہ بات مشہور سیاح مسلم بن جبیر نے کہی ہے۔ انہوں نے چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں شام، عراق اور مصر کا سفر کیا اور اپنے سفرنامہ میں وہاں کے مدارس اور ان کے حالات کو محفوظ کیا تھا۔

فاطمی اور ایوبی عہد میں مدارس کے اعتبار سے مصر کو برتری حاصل رہی۔ عہد فاطمی میں صرف قاہرہ کے مدارس کی تعداد ۲۰ تھی۔ خلیفہ حاکم بامر اللہ نے وہاں دار العلم یا دار الحکمۃ کے نام سے ایک بڑی دانش گاہ تعمیر کرائی تھی۔ اس میں مدرسین، اور ماہر علم وفن مقرر کیے گئے۔ اس سے ایک بہت بڑی لائبریری بھی ملحق کردی گئی جس میں نادر کتابوں کا عظیم ذخیرہ تھا۔

ایوبیوں کے مشہور مدارس میں سے ایک قدس کا مدرسہ ''المدرسۃ الصلاحیۃ'' ہے۔ جس کی بنیاد سلطان صلاح الدین ایوبی نے ڈالی تھی۔ دوسرا دمشق کا مدرسہ ''المدرسہ العادلیہ'' ہے،

۱۔ احمد الشطی: مجموعۃ الابحاث فی الحضارۃ الاسلامیۃ، دمشق، ۱۹۱۳، ص ۹۰

۲۔ ناجی معروف، ص ۵

جسے صلاح الدین ایوبی کے بھائی ملک عادل نے بنوایا تھا۔ اسی طرح ''المدرسہ المہذ بیہ'' قاہرہ میں اور ''المدرسۃ الناصر'' یہ فسطاط میں قائم کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ مصر میں ایوبیوں کے مدارس کی تعداد ۲۵ تک پہنچ چکی تھی۔ اسپین کے چند مرکزی شہروں میں مثلاً قرطبہ، اشبیلیہ اور غرناطہ میں بڑے بڑے مدارس قائم تھے۔ صرف قرطبہ کے مدارس کی تعداد الحکم المستنصر الثانی ابن عبدالرحمٰن الناصر (۳۵۰-۳۶۶) کے دور خلافت میں ۸۰ تھی۔ غرناطہ میں جامعہ علمیہ کبری کے علاوہ سترہ مدارس تھے۔ جامعہ علمیہ کبری کی بنیاد بنی نصر کے ساتویں سلطان یوسف ابوالحجاج نے ڈالی تھی۔

ان مدارس میں نہ صرف یہ کہ تعلیم کی کوئی فیس نہیں تھی، بلکہ طلبہ کو ان کی حوصلہ افزائی کے طور پر اسکالرشپ بھی دی جاتی تھی۔ اسلامی حکومت کے مختلف حصوں اور عیسائی دنیا کے تمام گوشوں سے یکساں طور پر تشنگان علم نے اس کا رخ کیا۔ ان تمام لوگوں میں علم کی سچی محبت اور پر خلوص دوستی کی روح رچی بسی تھی۔

تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ ان تشنگان علم میں بارہواں پوپ سلفسٹر (Silvestre) بھی تھا جس نے راہبیت کے زمانے میں حصول علم کی خاطر قرطبہ کا سفر کیا تھا۔ بعد میں اس کا شمار پوپ کے علماء میں ہوا۔

ابوبکر بن معاویہ ان ممتاز علماء میں ہیں جنہوں نے نئی نسل کی تربیت پر توجہ دی تھی اور علوم عربیہ واسلامیہ کی تعلیم وتدریس کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ انھوں نے حدیث کی تدریس کے لیے حلقہ قائم کیا۔ دوسرے ابوعلی قالی بغداد کے عالم ہیں، انہوں نے 'الأ مالی' نام کی ایک مشہور کتاب بھی لکھی ہے۔ یہ سلطان ناصر کے زمانہ میں اندلس پہنچے۔ وہاں عربی ادب اور تاریخ پر ان کا لکچر ہوا کرتا تھا۔ اسی طرح ایک ممتاز عالم ابن قوطیہ بھی تھے جو زبان اور نحو کے استاد تھے۔

جون ثالث فالنیتیا(Jone III Valentia) علامہ دوزی (Dozy) کے حوالہ سے کہتے ہیں کہ یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم میں درجہ ذیل مضامین پڑھائے جاتے تھے: پڑھنا، لکھنا، قرآن کریم کا حفظ، قرآن کی تفسیر، حدیث نبوی کی شرح، وراثت کا علم، فقہ، لغت کے اصول اور وہ تمام علوم جن کا کسی نہ کسی طرح سے قرآن کریم سے تعلق ہو، مثلاً علم توحید، عربی زبان کے قواعد، عرب کی تاریخ، نظم، نثر، طب فلسفہ، علم نجوم اور علم موسیقی وغیرہ۔

وہ طالب علم جس سے پوری طرح استاد مانوس ہوجاتا اور اس میں تدریس کی صلاحیت کا احساس کرلیتا تو اسے تحریری اجازت دے دیتا۔ اب یہ طریقہ ڈگریوں کی شکل میں ترقی پاچکا ہے۔[1]

علمی مجالس:

مکاتب اور نظامیہ مدارس کے ساتھ علمی نشستوں نے بھی اسلامی معاشرے میں علم وثقافت کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ نشستیں خلفاء، وزراء، امراء اور گورنروں کے محل میں منعقد ہوتی تھیں۔ ان نشستوں میں بڑے بڑے علما شریک ہوتے اور مناظرہ کی مجلسیں بھی منعقد کرتے تھے۔ ان میں مختلف مسائل پر بحث ہوتی اور مکمل آزادی کے ساتھ مناقشہ ہوتا تھا۔

کتب خانے:

قاہرہ، بغداد، دمشق اور قرطبہ اپنے بڑے بڑے کتب خانوں کی وجہ سے مشہور ہیں جن میں ہزاروں کتابیں اور بے شمار نادر مخطوطات محفوظ ہیں۔ علمی وتعلیمی تحریک اور اس کے عروج میں ان کتب خانوں کا بڑا حصہ رہا ہے۔ ان سے محققین کو بڑا فائدہ حاصل ہوا اور ایک

1- جودۃ ہلال اور محمد محمود صبح، قرطبۃ فی التاریخ الاسلامی، قاہرہ، ۱۹۶۲ء، ص ۸۹-۸۸

زبان کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کی وسیع پیمانے پر تحریک شروع ہوئی۔ترجمہ کا کام سب سے پہلے عباسی دور میں ہوا۔اس سلسلے میں خاص طور پر مامون رشید کا دور نمایاں ہے۔

شروع میں یا تو کتب خانے مساجد میں بنائے گئے یا انہیں مساجد سے ملحق رکھا گیا۔لیکن مستقل اور آزاد کتب خانوں کے قیام کا آغاز عباسی خلافت کے پہلے دور میں ہوا اور یہ سلسلہ آخری اسلامی عہد تک جاری رہا۔ان کتب خانوں میں کتابوں کی حفاظت کی خاطر بڑی بڑی الماریاں بنائی جاتی تھیں۔اسی طرح تالیف و ترجمہ کے لیے بنے کمروں کے ساتھ مطالعہ کے لیے بھی بڑے بڑے ہال موجود تھے۔

بیت الحکمہ اور خزانۃ الحکمہ نامی کتب خانے بغداد کے شہرت یافتہ کتب خانوں میں شمار ہوتے ہیں۔اس کی بنیاد ہارون رشید نے ڈالی تھی اور مامون کے عہد خلافت میں اس کا کام مکمل ہوا تھا۔جہاں کتابوں کا ایک عظیم ذخیرہ تھا۔بیت الحکمہ میں تالیف و ترجمہ کے لیے مخصوص کمرے بنے ہوئے تھے۔مامون رشید نے قیصر روم کو خط لکھ کر اس کے پاس موجود نادر کتابیں منگائی تھیں اور اس کتب خانہ کے مترجمین کو حکم دیا تھا کہ ان کتابوں کو، جو یونانی اور سریانی زبانوں میں تھیں، عربی زبان میں منتقل کریں[1]

بغداد کے مشہور کتب خانوں میں سے ایک، مدرسہ نظامیہ سے ملحق تھا۔اس کتب خانہ میں مطالعہ کی خاطر بڑے بڑے ہال بنائے گئے تھے۔اس کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں پینے کے پانی کا شاندار حوض بنا ہوا تھا۔کتب خانہ کے اندر موجود کتابوں کی تعداد تقریباً ۸۰ ہزار تھی۔ابن جوزی کہتے ہیں کہ مدرسہ نظامیہ میں وقف کردہ کتابوں کی تعداد چھ ہزار تھی۔

قاہرہ کے مشہور کتب خانوں میں ایک ''خزانۃ الحکمہ'' نامی کتب خانہ ہے۔اس کی

۱- احمد امین، ضحیٰ الاسلام، ج ۲، ص ۶۱

تعمیر فاطمیوں نے کرائی تھی۔ مقریزی دار الحکمت سے متعلق رقمطراز ہیں کہ ''خود مختار بادشاہ محمد بن عبداللہ مسبحی نے کہا ہے کہ اسی شنبہ کو یعنی ۱۰ جمادی الاخری ۳۹۵ ہجری کو میں نے دار الحکمت کے نام سے قاہرہ میں ایک ادارہ کی بنیاد رکھی۔ اس میں فقیہ حضرات مسند نشیں ہوئے اور محلوں کی بھری ہوئی الماریوں سے کتابیں نکال کر وہاں لے جائی گئیں۔ اس میں لوگ آئے اور جو کچھ اس سے لکھنا چاہا لکھا، اسی طرح جس نے پڑھنا چاہا پڑھا۔ جب اس عمارت کا فرش تیار ہو گیا اس کی زیبائش ہوگئی اور اس کے سبھی دروازوں اور گلیوں میں پردے لٹکا دیے گئے اور ہر کام کے لیے الگ الگ لوگ متعین کر دیے گئے یعنی جب ہر طرح سے کام مکمل ہو گیا تو قراء، ماہرین لغت، زبان داں اور اطباء بھی اس کتب خانہ کے رونق بنے اور امیر المومنین الحاکم بامر اللہ کی الماری سے حاصل کردہ کتابیں بھی اس کی زینت بنیں جو علوم وفنون، آداب اور ان کی طرف منسوب خطوط پر مشتمل ہیں۔ یہ اتنی تعداد میں ہیں کہ ان کے علاوہ کسی بادشاہ کے پاس اتنی کتابوں کا خزانہ سنا نہیں گیا۔ امیر المومنین نے اسے ہر طبقہ کے لیے وقف کر دیا تھا۔ جو شخص پڑھنا یا غور وخوض کرنا چاہے وہ بغیر کسی تردد کے کر سکتا تھا۔ ان لائبریریوں کی ایک بے مثال خوبی یہ بھی تھی کہ وہاں ان تمام افراد کے رزق کا انتظام ہو جاتا جو وہاں بیٹھنے آتے یا وہاں کسی خدمت پر مامور ہوتے، وہ خواہ فقیہ ہوں یا کوئی اور۔ اس کتب خانہ میں طرح طرح کے لوگ آتے۔ کوئی کتاب کے مطالعہ کی غرض سے، کوئی کتاب کی تصنیف وتالیف کے لیے تو کوئی محض جان کاری حاصل کرنے کے لیے۔ اس میں روشنائی، قلم، کاغذ اور دوات وغیرہ ساری ضروری اشیاء بھی موجود رہتی تھیں [1]

ان کے علاوہ ملک شام کا مشہور کتب خانہ جسے فاطمیوں نے شہر طرابلس میں تعمیر

۱- المقریزی، الخطط، ج۱، ص۴۵۹

کرایا تھا۔ الخزائن النوریہ نامی کتب خانہ جسے نور الدین محمود زنگی نے بنوایا اس کے علاوہ انطا کیہ، دمشق وحلب کے وہ کتب خانے جو مدارس سے ملحق تھے، کافی مشہور ہیں۔

اندلس کا کتب خانہ:

حکم بن ناصر (وفات: ۳۶۶ھ) نے قرطبہ میں اپنے محل کے اندر ایک لائبریری کی بنیاد رکھی۔ اس لائبریری میں ۴ لاکھ سے بھی زیادہ کتابیں تھیں۔ ایک یورپین مصنف کونڈے (Conde) کہتا ہے: ''اسپین نے جب مسلمانوں سے قرطبہ کی حکومت چھین لی تو ایک دن میں کتابوں کی ستر لائبریریوں کو نذر آتش کر دیا۔ جس میں تقریباً ایک ملین سے زیادہ کتابیں تھیں۔

فرانسیسی مؤرخ گستاؤلیبان (Gustave Le Bon) کہتا ہے ''اندلس کا اسقف اعظم ثمینیس (Pope Thmines) نے تقریباً ۸۰ ہزار سے زیادہ مخطوطات کو جلا ڈالا۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے ایسا کر کے اندلس کی تاریخ سے عربوں کا نام ونشان تک مٹا دیا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکا کہ عرب کے فکری سرمایوں کے علاوہ شہر اندلس میں جاری وساری ان کے دوسرے آثار وباقیات، ہی قیامت تک ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں'' [1]

ان عام کتب خانوں کے علاوہ کچھ ذاتی کتب خانے بھی تھے جن کے مالک وزراء امراء، علماء اور تجار ہوا کرتے تھے۔ چوں کہ انہیں علم ومعرفت سے والہانہ شغف تھا اس لیے وہ کتابیں جمع کرتے۔ ضرورت کی کتابیں ان کی دسترس میں رہتیں تا کہ ان سے ایسے محققین اور دانشور فائدہ اٹھا سکیں جو علمی بحث وتحقیق کے لیے ان کی ضرورت محسوس کرتے ہوں۔

اسلامی عہد میں کتابوں کی توجہ کا دائرہ کتاب کی تصنیف اوران سے فائدہ اٹھانے

---

[1] گستاؤلیبان (Gustave Le Bon)، حضارۃ العرب، ترجمۃ عادل زعیتر، ص ۲۸۲

تک ہی محدود نہ تھا بلکہ طلبہ کی توجہ بھی کتابوں کی طرف مبذول کرائی جاتی اور انھیں ان سے فائدہ اٹھانے کے طریقوں سے واقف کرایا جاتا۔ ابن جماعہ (المتوفی ۷۳۳ ہجری) نے اپنی کتاب تذکرۃ السامع و المتکلم فی ادب العالم و المتعلم کے اندر ایک خاص باب رکھا ہے جس میں ان موضوعات پر گفتگو کی ہے کہ کتابوں کا (جو حصول علم کے لیے بطور آلہ استعمال ہوتی ہیں۔) کس طرح ادب کرنا چاہیے، اس کی کس طرح حفاظت کرنی چاہیئے، ان کے خریدنے اٹھانے اور ان کے لکھنے میں کیا آداب بجالانا چاہیئے وغیرہ۔ اس نے اس باب میں اسی قسم کے آداب سے متعلق دوسرے بہت سے امور پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ابن جماعہ نے ''باب'' کے آغاز میں کتابوں کے حصول پر طلبہ کو ابھارا ہے خواہ یہ خرید کر ہو یا کرایہ پر ہو یا عاریتاً لے کر ہو۔ وہ کہتے ہیں: مناسب ہے کہ انتہائی ناگزیر حالات میں ہی طلبہ کتابیں نقل کریں اور کیا ہی اچھی بات ہوگی کہ کتاب اس شخص کو عاریتاً دی جائے جو کتابوں کا صحیح خیال رکھے۔ مستعار لینے والے ہر شخص کے لئے ضروری ہے کہ بلاضرورت کتاب کو اپنے پاس زیادہ دنوں تک نہ رکھے بلکہ جب ضرورت پوری ہو جائے تو جلد از جلد واپس کردے۔ جب مالک کتاب طلب کرے یا اس کی ضرورت محسوس کرے تو کتاب اپنے پاس ہرگز نہ روکے رہے۔ اسی طرح جب کتاب نقل کرلے یا اس کا مطالعہ کرلے تو اسے زمین پر نہ بکھیر دے بلکہ اسے دو کتابوں یا کئی چیزوں کے درمیان میں رکھے یا آفس کی میز پر تاکہ وہ اس سے بے خیال نہ ہوسکے۔ ابن جماعہ نے کتاب خریدنے یا مستعار لیتے وقت اس پر پوری نگاہ ڈال لینے کی بھی نصیحت کی ہے۔

وہ مزید کہتے ہیں کہ ''جب کوئی کتاب مستعار لے تو مناسب ہے کہ کتاب لینے اور واپس کرنے کے وقت کتاب کو غور سے دیکھ لے اور جب کوئی کتاب خریدے تو کتاب کے اول

آخر اور بیچ کے صفحات کو دیکھ لے اور ساتھ ہی یہ بھی جائزہ لے لے کہ اس کے ابواب باترتیب ہیں یا نہیں۔ یا صفحات صحیح ہیں یا نہیں۔ وقت کی کمی ہو تو اس چیز پر ضرور نگاہ ڈالے جس میں غلطی ہونے کا امکان یا گمان ہو، کتاب نقل کرتے وقت طالب علم کو باریک کتابت سے باز رہنے پر زور دیا ہے۔ چونکہ تحریر ایک علامت ہوتی ہے لہٰذا وہ جتنی واضح ہوگی اتنی ہی بہتر ہوگی۔ انہوں نے کچی کے بجائے پکی روشنائی استعمال کرنے کی تلقین کی ہے۔ "کیونکہ وہ دیرپا ہوتی ہے۔" لوگوں کا کہنا ہے کہ قلم اتنا سخت نہ ہو کہ تیز رفتاری میں رکاوٹ آئے اور نہ اتنا نرم کہ خم آجائے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری کتابت اچھی ہو تو اپنے سرکنڈے کو لمبا اور موٹا رکھو اور نوک دائیں طرف کاٹو۔

ابن جماعہ نے طالب علم کے لیے کتاب کی تصحیح اور اسے اصل سے ملانے یا شیخ کے سامنے پیش کرنے کے طریقوں کی وضاحت کی ہے۔ حواشی، فوائد اور اہم تنبیہات لکھنے کا طریقہ بیان کیا ہے اور ہر حالت کے لیے رموز متعین کیے ہیں۔ ان تمام باتوں کے بعد انہوں نے ابواب، تراجم اور فصل کے لکھنے کے لیے لال روشنائی کے استعمال کرنے کی اجازت دی ہے۔ ابن جماعہ نے یہ باب، تاریخ اور جگہ کا نام لکھ کر ختم کیا ہے۔

ابن جماعہ نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ کس طرح ہم طالب علم کو کتاب کی خدمت اور اس کی رعایت کی تلقین کریں اور کس طرح اس کے لکھنے اور فائدہ اٹھانے کے طریقے بنائیں۔

عالمی تہذیب وثقافت پر اسلامی فتوحات کے اثرات

رسول ﷺ کی زندگی میں اسلام جزیرۂ عرب سے باہر نہیں نکل سکا۔ البتہ وفات سے قبل آپ ﷺ نے بعض پڑوسی ممالک کو دعوتِ اسلامی کے چند خطوط بھیجے[1] لیکن جب اسلامی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو بہت سے ممالک ایسے بھی تھے جہاں اسلام کی روشنی پہنچ چکی تھی اگر چہ باقاعدہ طور پر ابھی وہاں اسلامی افواج داخل نہیں ہو سکی تھیں۔ ۱۷ھ میں شام فتح ہوا، جو مختلف النوع تہذیب وتمدن کا گہوارہ تھا۔ ۲۰ھ میں مصر اسلامی قیادت کے زیرِ نگیں آیا، جو قدیم مصری، یونانی اور رومی ثقافت کا وارث تھا۔ ۲۱ھ میں عراق پر اسلامی پرچم لہرایا پھر یکے بعد

۱- جن بادشاہوں اور امراء کے پاس رسولؐ نے خطوط بھیجے وہ درج ذیل ہیں، ساتھ میں ان قاصدین کا بھی ذکر ہے جن کے ذریعہ ان خطوط کو بھیجا گیا: (۱) وحید بن خلیفہ الکلبی - ہرقل شہنشاہ روم کے پاس، (۲) عبداللہ بن حذیفہ السہمی - ایران کے کسریٰ کے پاس، (۳) عمرو بن امیۃ الضمری - نجاشی کے پاس، (۴) حاطب بن ابی بلتعہ - مقوقس کے پاس، (۵) سلیط بن عمرو العامری - ھوذۃ بن علی الحنفی ملک یمامہ کے گورنر کے پاس، (۶) شجاع بن وھب - حارث بن ابی شمل غسانی کے پاس، (۷) العلی بن الحضرمی - بحرین کے بادشاہ بنی قیس کے بھائی منذر بن ساوی کے پاس، (۸) عمرو بن العاص - عمان کے حکمراں جلندی کے صاحبزادوں جیفر اور عباد کے پاس
(ابن ھشام، ج ۴، ص ۲۷۹/ الطبری، ج ۲، ص ۸۵-۸۴)

دیگر ے اسلامی فتوحات کا سلسلہ وسیع ہوتا گیا۔ جہاں ایک طرف ملک فارس اور دوسری ریاستیں اسلامی مملکت کے زیر اثر آئیں اور مسلمانوں کا اقتدار سندھ، بخارا اور سمرقند تک وسیع ہوگیا، تو دوسری طرف مسلمان مغربی ممالک اور شمالی افریقہ سے ہوتے ہوئے ۹۳ھ میں مغربی یورپ یعنی اندلس اور فرانس میں نہر اللواء تک جنوبی اٹلی اور بحر متوسط کے مغرب میں واقع تمام جزیروں تک پہنچ گئے۔[1]

مختلف رنگوں، نسلوں اور زبان کے لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہوتے گئے۔ لوگ صرف اسلام کے مطیع اور فرمانبردار ہی نہیں بلکہ اس کو پھیلانے اور اپنی جان و مال سے اس کا دفاع کرنے کے لیے ہمہ تن تیار بھی ہوئے۔

بلاشبہ اسلام کے اندر ایسے مخصوص عوامل تھے جو تیز رفتاری اور جامعیت کے ساتھ اس کی نشر واشاعت میں اہم محرکات ثابت ہوئے۔ یہ تیزی پہاڑوں، وادیوں، صحراؤں اور ریگستانوں میں ایک سی رہی۔ اسلام کی جامعیت نے کبھی گورے کالے، دیہاتی اور شہری میں تفریق نہیں کی۔ اونچے نیچے، قوی اور ضعیف میں کوئی عملی امتیاز نہیں رکھا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"یا أیھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثی وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان أکرمکم عند اللہ أتقاکم۔" (سورۃ الحجرات:۱۳)

''اے لوگو! ہم نے تم کو ایک ہی نر اور ناری سے پیدا کیا ہے اور تم کو کنبوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا ہے کہ تم باہم گر تعارف حاصل کرو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ اشرف وہ جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔''

---

[1] توماس آرنلڈ (Thomas Arnold)، الدعوۃ الی الاسلام، ترجمہ حسن ابراہیم حسن وعبدالمجید عابدین، قاہرہ، ۱۹۴۷ء، ص ۱۳۵

اسلام کی بنیادی اصول اور اس کے نظام حکمرانی میں حق اور خیر کے وہ تمام عناصر مجتمع ہو گئے ہیں جن کا انسانیت، اپنے آداب زندگی اور طرز بود و باش کے اختلاف کے باوجود تقاضہ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جتنی تہذیبیں اسلام کے سائے میں پیدا ہوئیں۔ان کو اس نے مضبوط کیا اور ان کی حفاظت کی۔ دوسری تہذیبوں کے جن عناصر کو اسلام نے اخذ کیا تو پہلے ان کو اپنے رنگ میں ڈھالا اور پھر ان کا استعمال کیا اور ترقی دی۔ ضروری تھا کہ اس کے پاس طاقت وقوت اور اطمینان بخش زندگی کے وہ تمام وسائل ہوتے جن کی طرف مختلف قومیں اور جماعتیں بھاگنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس زمانے میں ان کے پاس خالص اسلام تھا۔ ایمان کی قوت تھی۔ وہ تمام برائیوں اور گندگیوں سے پاک تھے۔ وہ اپنی اچھائیوں سے دشمنوں کی خرابیوں کا مقابلہ کرتے تھے۔ ان کے اخلاق عالیہ تلوار اور تیز اور آگ سے زیادہ بااثر تھے۔

گستاؤلیبان (Gustave Le Bon) کہتا ہے: ''قرآنی تعلیمات کی اشاعت میں طاقت کا عمل دخل نہیں تھا، جن ملکوں پر عرب فاتحین کا اقتدار قائم ہوا اس میں انہوں نے شہریوں کو دین اختیار کرنے کی آزادی دی۔ چناں چہ بعض عیسائیوں نے اسلام قبول کیا اور عربی زبان کو اپنا لیا۔ ایسا انہوں نے مسلمان فاتحین کے عدل وانصاف اور اسلام میں سہولت اور آسانی کو دیکھتے ہوئے کیا۔ اس سے قبل انہیں یہ چیزیں کہیں اور نہیں ملی تھیں۔ اسلام تلوار سے نہیں دعوت سے پھیلا۔''[1]

کونٹ دی کاسٹری (Conte Henri De Castre) اپنی کتاب میں لکھتا ہے
''عیسائیت کی طرح اسلام کے داعیوں کا ایسا کوئی مخصوص گروہ نہیں تھا جو صرف دعوت وتبلیغ پر مأمور ہو۔ اگر اسلام کے اندر قوم کے کچھ ایسے مضبوط لوگ ہوتے تو ہم اسے تیز رفتاری کے

1- گستاؤلیبان (Gustave Le Bon)، ص ۳۲۵

ساتھ اسلام کی نشرو اشاعت کا ایک اہم سبب سمجھ سکتے تھے جیسا کہ بادشاہ شارلمان جنگوں میں ہمیشہ پادریوں اور مذہبی رہنماؤں کا ایک گروہ اپنے ساتھ لیے رہتا تھا تاکہ وہ غلبہ حاصل کرنے کے بعد ان قوموں اور ملکوں کے لوگوں کا دل جیت سکے، لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو ہم اس میں کسی ایسے مخصوص گروہ کو نہیں پاتے جو فوجوں کے ساتھ جاتا ہو لیکن اس کے باوجود کسی نے ان کے طریق جنگ اور طریق گفتار کو برا نہیں سمجھا''۔

افریقہ میں دعوت اسلام کی ترویج کے سلسلے میں ایک عیسائی مصنف ''ہوبیر دیشان'' (Hober Deshan) اپنی کتاب میں لکھتا ہے'' افریقہ میں اسلام جبراً نہیں پھیلا بلکہ اس میں عوام الناس کی رضامندی شامل تھی۔ یہ کام ایسے مختلف داعیوں نے انجام دیا جن کے پاس ان کے گہرے ایمانی قوت کے بجز کچھ بھی نہ تھا۔ اسلام صلح وآشتی کے سہارے ایک قوم سے دوسری قوم اور ایک ملک سے دوسرے ملک پہنچا۔ جب امراء اس کو قبول کر لیتے تو بقیہ لوگ بآسانی اس کے مطیع بن جاتے۔ یہی اس زمانے کے داعیوں کا ہدف تھا۔ اسلام کی اشاعت میں ایک دوسری چیز جو بہت مددگار ثابت ہوئی وہ اس کا دین فطرت اور انسانی طبیعت کے مطابق ہونا ہے۔ اس میں کوئی لوچ ہے نہ اس کے معنی میں کوئی خامی ہے۔ بلکہ اس میں مختلف احوال و کیفیات کے تقاضے پورے کرنے کی صلاحیت ہے۔ اس کو قبول کرنا انتہائی آسان اور سہل ہے ۔ جو شخص اسلام قبول کرتا ہے اس سے صرف دو شہادتیں مطلوب ہوتی ہیں، جن کے بعد وہ مسلمانوں کے زمرے میں شامل ہو جاتا ہے۔ چناں چہ اسلامی اقدار اور ان کے مظاہر ، جو افریقی تکلفات سے یکسر پاک تھے ، افریقیوں کے یہاں بہت مقبول اور ہر دلعزیز بن گئے ۔ یہ مظاہر اجر وثواب، تسبیح، عربی کتابت، دینی وقار اور بندگی کے شعائر کی صورت میں ان کے سامنے تھے، جو مسلمانوں کے اندر اعلیٰ مرتبت اور سحر کن جاذبیت کا احساس دلاتے ہیں۔ جو

شخص اسلام قبول کرتا ہے، اسے اپنی شخصیت میں وقار واحترام کا احساس ہوتا ہے اور ایسا لگتا ہے گویا اس کی قوت اور زندگی کی امنگ میں اضافہ ہوا ہے۔

دوسرے مذاہب کے لیے اسلام کا بنیادی موقف واضح ہے، جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے۔﴿قل يا أهل الكتاب تعالوا الى كلمة سواء بيننا وبينكم ألا نعبد الا الله ولا نشرك به شيئا ولا يتخذ بعضنا بعضا أربابا من دون الله فان تولوا فقولوا اشهدوا بانا مسلمون﴾ (سورة آل عمران: ٦٤)

> ''کہہ دو: اے اہل کتاب! اس چیز کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں مشترک ہے۔ یہ کہ ہم کو اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب ٹھہرائے۔
> اگر وہ اس چیز سے اعراض کریں تو کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو مسلم ہیں''۔

رسول ﷺ نے اہل کتاب کے ساتھ اپنے موقف میں اسی آیت کو اپنا شعار بنایا اور حبشہ کے بادشاہ نجاشی، روم کے ہرقل اور دوسرے پڑوسی ملکوں کے سربراہوں کے نام اپنے خط میں بھی اسی رویے کو اپنایا۔

یہی دعوت رسول ﷺ نے دوسرے مذاہب کے لوگوں کو دینے کی ہدایت کی ہے۔ اگر وہ اس دعوت کو قبول نہیں کرتے تو ان کے راستے آپ سے الگ، ان کا دین ان کے لیے اور آپ کا دین آپ کے لیے ہوگا۔ جو کوئی رسول ﷺ کے ان خطوط کا مطالعہ کرے گا، جو آپ نے اردگرد کے سربراہان مملکت کو لکھے تھے تو وہ دیکھے گا کہ ان میں نہایت نرم اور مشفقانہ نصیحتیں ہیں اور بہتر انداز سے دعوت حق کا پیغام ہے۔ جب اسلامی حکومت کے سیاسی تعلقات مفتوحہ پڑوسی ملکوں اور جماعتوں کے ساتھ خراب ہونے لگے تو اسلام نے ان تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے ایک نیا طریقہ متعارف کرایا۔ وہ تھا مختلف جماعتوں، پڑوسی ملکوں اور مفتوح

سلاطین سے جزیہ لینا، لیکن ایسا اسی صورت میں کر سکتے تھے جب وہ اسلام کی دعوت قبول نہ کریں اور اپنے دین پر قائم رہنا چاہیں۔[1]

خلفائے راشدین نے بھی مفتوح قوموں سے اپنے معاملات اسی طور سے نبھائے۔ ان کی رعایا میں سے ہر ایک کو اپنے سابقہ مذہب پر باقی رہنے کی آزادی ہوتی۔ ان کے جان و مال اور عبادت گاہوں کی حفاظت کی ذمے داری بھی اسلامی مملکت کے سپرد ہوتی۔ یہ صلح وامان اس وقت تک قائم ودائم رہتا جب تک وہ اس امان اور ذمہ داری کے بدلے ٹیکس ادا کرتے رہتے۔ اس کی واضح مثال عمر بن خطابؓ کا وہ پیغام ہے جو انہوں نے ۱۵ ہجری میں بیت المقدس کے فتح ہونے کے بعد اہل ایلیا کے پاس بھیجا تھا۔ جس میں انہوں نے یہ لکھا تھا:

> ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، عمر بن خطاب امیر المومنین کی طرف سے اہل ایلیا کو امان دی جاتی ہے۔ ان کے مال، ان کی جان، ان کی عبادت گاہیں، ان کی صلیبیں، ان کے بیمار، ان کے صحت منداور پوری ملت کو امان دی جاتی ہے۔ ان کے چرچ باقی رہیں گے، گرائے نہیں جائیں گے اور اس میں ردو بدل نہیں کیا جائے گا اور ان کے مال میں کوئی خرد برد نہ ہوگی، لیکن ایلیا والوں پر یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ جزیہ ادا کریں جیسا کہ اہل مدائن ادا کرتے ہیں اور آخر میں یہ فرمایا کہ جو اس خط میں مذکور ہے وہ اللہ کا عہد ہے، رسول ﷺ، خلفاء اور مومنین کا عہد ہے لیکن اس وقت جب کہ لوگ جزیہ ادا کردیں۔''[2]

اسی طرح کا سلوک مسلم فاتحین نے مصر میں کیا۔ مسلمانوں کو ان کے بعض دینی

۱۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مجموعۃ الوثائق السیاسیہ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدۃ، قاہرہ، ۱۹۴۱ء ص ۳۰، ۵۷-۵۸، ۲۶۸-۲۶۹

۲۔ الطبری، ج ۲، ص ۶۰۹

نظریاتی اختلاف کا علم تھا جو اس وقت مصر اور بزنطینی عیسائیوں کے درمیان پایا جاتا تھا۔ چناں چہ انھوں نے ہر فریق کو یہ سہولت دی کہ جو بھی مسلک چاہیں اختیار کرلیں اور ان کے پادری کو ان کے سیاسی امور کا ذمہ دار بنادیا اور مقوقس کے زمانے میں جو چرچ منہدم کردیے گے تھے ان کی تعمیر ان کے سپرد کردی گئی۔[1]

عہد وسطی میں اسلامی سلطنت اور یورپ کے درمیان جو کہ نصرانیت پر قائم تھا، محققین نے ایک بڑا فرق یہ بتایا ہے کہ اسلامی ریاست کے اندر مختلف مذاہب وملت کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، جب کہ عیسائی سلطنت میں یہ رواداری مفقود تھی۔ مشترکہ معیشت اور بعض معاہدوں کے وجود رواداری کی ایک عظیم مثال ہے اور اس کا مظہر ملت و مذہب کے تقابلی علم کا آغاز تھا۔ دوسرے معنوں میں اختلاف کے باوجود مذہب وملت کا مطالعہ ہوتا تھا بلکہ بطور خاص دوسرے مذہب کا مطالعہ بڑے شغف سے کیا جاتا تھا۔[2]

اسلامی شریعت میں غیر مسلموں کے لیے کام کاج کے دروازے بند نہیں تھے۔ صنعت وحرفت میں ان کے قدم جمے ہوتے تھے جس سے ان کو بہت نفع حاصل ہوتا تھا۔ وہ سنار تھے، تاجر تھے، جاگیردار اور ڈاکٹر تھے۔ اسلامی حکومت غیر مسلموں کے دینی شعائر میں دخل اندازی نہیں کرتی تھی بلکہ بعض خلفاء ان کے تہواروں اور جلوس میں شرکت کرتے اور ان کی حفاظت کا حکم دیتے تھے۔ ان کے معاملات کا تصفیہ اسلامی حکومت ان ہی پر چھوڑ دیتی تھی اور ان کے فیصلے ان کی مخصوص عدالتوں کے ذمہ کردیتی۔ ان کے روحانی پیشوا ان عدالتوں کے جج ہوا کرتے تھے۔ ذمی لوگ، مسلمانوں کی رواداری کی بنا پر اپنے جان و مال کی ذمہ داری و حفاظت کے لیے اپنی وسعت کے مطابق جزیہ ادا کرتے تھے۔ بعض مغربی اہل قلم اس کو فوجی

۱- ساویرس بن المقفع، سیر الآباء البطارکۃ، ص ۲۴/۶/۵

۲- آدم میٹز (Adam Mitez)، الحضارۃ الاسلامیۃ فی القرن الرابع الہجری، ترجمۃ محمد علی ابوریدۃ، قاہرہ، ۱۹۴۰، ج ۱، ص ۹۶-۵۵

دفاع کے ٹیکس کے مشابہ مانتے ہیں کیونکہ اسے صرف وہی دیتا تھا جو ہتھیار اٹھانے کی استطاعت رکھتا ہو۔ اس سے مصیبت زدہ، کمزور اور مذہبی لوگ بری الذمہ ہوتے تھے الا یہ کہ ان کے پاس سہولت ہو۔ اس کا آغاز مسلمانوں نے نہیں کیا بلکہ ان سے پہلے اہل روم یہودیوں اور مجوسیوں سے سال میں ایک دینار لیتے تھے۔ اسی طرح عیسائیوں نے بھی مسلمانوں پر ایک قسم کا جزیہ ادا کرنا ضروری قرار دیا جب انہوں نے بعض اسلامی ممالک فتح کیے تھے۔

جب ہم مشرق ومغرب کے اسلامی ممالک کی سرحدوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اسلامی نظام میں مذہبی رواداری کا طریقہ رائج تھا۔ یہ دینی رواداری اس نظام کی ایک اہم بنیاد تھی۔ کونٹ ہنری دکاسٹری (Conte Henry De Castre) اپنی کتاب ''اسلام'' میں کہتا ہے ''حبر میشون'' (Hebr Mishon) کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ تاریخ پڑھنے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کا معاملہ سخت نہیں تھا۔ یہ چیز ان کے حسن اخلاق اور نرمی کی دلیل ہے۔ یہ چیز غیر مسلموں میں نہیں ملی اور خاص طور سے شفقت، رحم اور محبت یورپ کے لوگوں میں مفقود تھی۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس پر لعن وطعن کرنے میں مجھے کوئی چیز مانع نہیں ہے۔

اسٹان لی پول (Stan Li Pol) کہتا ہے:

''کچھ ہی دنوں کے بعد لوگوں کو یہ احساس ہونے لگا کہ نظام حکومت کی تبدیلی سے ان کو فائدہ پہنچا ہے۔ اسپین کے لوگوں کو اسلامی عہد میں اس بات کی اجازت تھی کہ وہ اپنی شریعت اور قضاۃ کا تعین خود کرلیں۔ اس دور میں انہیں میں سے ان کے حکام مقرر کردیے جاتے تھے۔ وہ علاقوں کا نظم ونسق سنبھالتے ٹیکس وصول کرتے اور ان کے درمیان پیدا شدہ اختلافات میں فیصلہ کرتے تھے۔ شہریوں کو جزیہ دینا ہوتا تھا۔ خراج اسی کو ادا کرنا تھا جس کے پاس کھیتی کی زمین ہوتی تھی۔ جب کہ عہد قوط میں

لوگوں کو ٹیکس اور حکومتی اخراجات وغیرہ سب تنہا برداشت کرنا پڑتے تھے۔ جزیہ صرف دوسرے مذاہب کے لوگوں تک محدود کر دیا گیا تھا۔ جہاں تک زمین کے ٹیکس کی بات ہے تو یہ اسلامی حکومت میں یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں پر یکساں طور پر فرض تھا۔ دینی رواداری نے اسپین کے باشندوں کو شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا۔ عرب نے ان کو اختیار دے دیا کہ جس طریقے سے چاہیں عبادت کریں۔ انہیں کسی خاص دین کو اپنانے کے لیے مجبور نہیں کیا جیسا کہ قوط، یہود کے ساتھ کرتے تھے۔ اسی برتاؤ اور رواداری کا اثر تھا کہ اسپینی لوگ مسلمانوں کے نظام کو انگریزوں اور قوط کے نظام پر ترجیح دیتے تھے۔ عرب مفتوحہ ممالک کے لوگوں سے گھل مل جاتے تھے۔ اسی بنا پر مختلف افکار وخیالات کا اختلاط ہوا اور تہذیبی وثقافتی امور کا تبادلہ ہوا۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو اسلامی تہذیب وتمدن کو پھیلانے، دوسرے تہذیبوں کا مطالعہ کرنے، ان سے آگہی حاصل کرنے، ان کا تقابل کرنے اور اس میں سے خیر کے پہلو کو لینے پر ابھارا ہے۔ یہ اسلام نے ہی بتایا کہ تہذیب کا ارتقا پوری انسانیت کی میراث ہے۔ اس پر کسی قوم کی اجارہ داری نہیں چلتی۔ جب وہ ایک سرحد پار کر کے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہے تو وہ اس جگہ کی اپنی خالص تہذیب تصور کی جاتی ہے[1]

گستاؤلیبان (Gustave Le Bon) کہتا ہے ''عربوں کے وضع کردہ تمدنی اصول میں فعال اور متحرک عامل ان کی زبردست ذہانت وفطانت ہے۔ وہ جوں ہی عرب کے صحراء سے باہر نکلے انہیں یونانی اور لاطینی تہذیب وتمدن سے سابقہ پڑا۔ عرب ان کے اصول اور طریق زندگی سے مطمئن نہیں ہوئے۔ عرب قوم کے اندر جدید علوم کا مطالعہ کرنے کا شوق اور جوش پیدا ہوا۔ بنفس نفیس وہ اسی حوصلہ اور جوش کے ساتھ، جس نے انہیں فاتح بنایا تھا، اب

---

[1] اسٹان لین پول (Stan Li Pol)، قصۃ العرب فی أسبانیا، ترجمۃ علی الجارم، قاہرہ، ۱۹۴۴ء، ص ۱۳۶

علم کی طرف راغب ہو گئے۔ ان کی پرانی عادات اور ماضی کے حالات انہیں اس کام سے نہ روک سکے۔ فکر و تحقیق کے میدان میں آزادی ان عوامل میں سے ایک ہے جس کی وجہ سے انہوں نے ترقی کی منزلیں بڑی تیز رفتاری سے طے کیں۔ تھوڑی ہی مدت گذری تھی کہ انھوں نے علم ہندسہ، فنون لطیفہ، اور سائنس کو اپنی طبیعت میں رچا بسا لیا جس سے ان کے کارنامے جانے پہچانے جاتے ہیں۔[1]

خلفاء نے سائنس دانوں اور محققین کی حوصلہ افزائی کی اور انہیں اپنے سے قریب کرلیا، اپنا معتمد بنالیا اور بحث وتحقیق میں مکمل آزادی دی۔ انھیں اتنا عطیہ دیا جاتا تھا کہ مطالعہ اور بحث وتحقیق کے علاوہ ان کو کسی اور چیز کے بارے میں سوچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

مسلمانوں کی یہ وجوبی خواہش تھی کہ ان کے تمام معاملات شرعی احکام کے موافق ہو جائیں۔ اس کے لیے انھیں ماحول کا مطالعہ کرنا اور ملکی حالات کا جائزہ لینا ضروری تھا۔ انہیں اپنے نظریات کو دیکھنے، جانچنے اور پرکھنے کے لیے اسلامی نقطۂ نظر کا خیال رکھنا واجب تھا تاکہ وہ اسی وقت تک اس سے سیکھیں، استفادہ کریں اور اس کو عام کریں جب تک وہ ان کے لئے نفع بخش اور مفید ہوں۔ یہی ان کے دینی تعلیم کا تقاضہ بھی تھا۔

یہی وجہ ہے کہ عربوں کے اندر ایسی ثقافتیں پیدا ہوئیں جس سے پورا عالم فیض یاب ہوا۔ لوگوں کے اندر اس کو جاننے اور اس سے استفادہ کرنے کا شوق بیدار ہوا۔ اس سے عربی زبان کی اشاعت پر اچھا اثر پڑا۔ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اندلس میں قائم عرب مملکت نے یورپ میں نئی، صالح اور مہذب فکر کو پروان چڑھایا۔ وہ عالمی ثقافت کی فکر تھی جسے مسلمانوں نے مغرب کی طرف منتقل کیا۔ افکار اور طرز معیشت میں عرب مسلمانوں کا تتبع

۱۔ گستاؤلیبان (Gustave Le Bon)، حضارۃ العرب، ص ۳۵۸

یورپ کی ضرورت اوران کے لئے اسوہ بن گئی۔ یہی نہیں بلکہ وہ شخص مہذب نہیں مانا جاتا تھا جسے عربی زبان اچھی طرح سے نہ آتی ہواور جو اسلامی تہذیب کا مطالعہ نہ کرتا ہو۔ مشہور مورخ دوزی (Dozy) نے اپنی کتاب ''الاسلام فی الاندلس'' میں اسپین کے ایک کاتب کا خط نقل کیا ہے جس میں اس نے اپنی قوم کے عربی زبان کی طرف میلان ورجحان کی وجہ سے لاطینی اور افریقی زبانوں پر ماتم کیا ہے۔ اس سلسلے میں اس کا قول ہے ''اصحاب ذوق وفطن پر عربی ادب کی نغمگی کا جادو ہوگیا ہے۔ وہ لاطینی زبان کو حقیر سمجھنے لگے ہیں اور عربی کی طرف مائل ہوگئے ہیں۔ مسلم فلسفیوں اور فقہاء کی تصانیف پڑھنے لگے۔ وہ عربوں کی کتابیں حاصل کرتے ہیں اور ان سے اعلیٰ کتب خانوں کو زینت بخشتے ہیں''۔

جارج سارٹن (George Sarton) اپنی کتاب ''العلوم و العمران فی العصور الوسطیٰ'' میں کہتا ہے ''عربی زبان آٹھویں صدی عیسوی کی تہذیب یافتہ دنیا میں خواص کے نزدیک علم اور مثبت ترقی وخوشحالی کی علم بردار بن گئی۔ تقریباً گیارہویں صدی عیسوی تک تمام زبانوں میں اس کو مرکزی حیثیت حاصل رہی اور اس نے اپنی برتری باقی رکھی۔ اگر گیارہویں صدی عیسوی کا کوئی شخص اپنے زمانے کے افکار وخیالات کو جاننا چاہتا تو اس کے لیے لازم تھا کہ وہ عربی زبان سیکھے کیونکہ اس وقت عربی زبان علم ومعرفت کی بین الاقوامی زبان تھی۔ صدیوں پر محیط محققین کی تلاشِ بسیار اور انتھک کوششوں کے بعد ہی علم ومعرفت کی کسی مشترک زبان کی یافت ممکن ہوسکی۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ متعدد نئی زبانوں کے سبب علمی مفہوم خلط ملط ہوسکتے ہیں۔

ایک انگریز عالم روجر بیکن (Roger Bacon) (۱۲۱۵-۱۲۹۲ء) کہتا ہے کہ فلسفہ کی اشاعت عربی زبان کے ذریعہ ہوئی ہے۔ اس لیے یورپ کا کوئی شخص فلسفہ کو اس وقت تک

صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتا جب تک اس زبان کو نہ سیکھ لے جس سے اس کو نقل کیا گیا ہے۔ بلکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ روجر بیکن کے بعض تلامذہ بذات خود اس پر گرفت کرتے تھے جس وقت وہ عربی، لاطینی نصوص کا غلط ترجمہ کرتا تھا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عربی جانتے تھے۔ عربی نصوص کا مطالعہ کرتے تھے اور پھر اپنے استاد کے فرمان کا موازنہ کرتے تھے۔ اس کے مطابق پریفولٹ (Priffault) کہتا ہے کہ روجر بیکن (Roger Bacon) نے عربی زبان وادب اور عربی علوم اوکسفورڈ یونیورسٹی میں ایسے اساتذہ سے سیکھی ہے جنھوں نے خود اندلس کے عرب اساتذہ کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا تھا۔ وہ اس بات کو کہنے سے کبھی نہیں گھبراتا تھا کہ عربی زبان اور عربوں کے علوم کی تحصیل ہی وہ واحد طریقہ ہے جس کے ذریعہ صحیح معرفت حاصل ہوسکتی ہے۔[1]

اس طرح عربی زبان کچھ ملکوں کو چھوڑ کر ان تمام ممالک پر چھا گئی جسے مسلمانوں نے بحر محیط سے بحر خلیج تک فتح کیا تھا۔ اس نے یونانی، لاطینی، قبطی، آرامی، سریانی، بربری، اور دوسری زبانوں کی جگہ لے لی۔ یہاں تک کہ وہ قومیں جنھوں نے اسلام قبول کرنے اور اسلامی حکومت میں شامل ہونے کے باجود اپنی زبان محفوظ رکھی، مثلاً ترکی اور بلاد فارس وغیرہ، انھوں نے بھی اس کو ذریعہ علم کے طور پر استعمال کیا۔

کوئی بھی زبان جو عربی کی طرح اصالت، زرخیزی اور الفاظ سے مالا مال ہو، اس کے لیے یہ دشوار نہیں کہ وہ عظیم تہذیب وتمدن کا ذریعہ بنے۔ لہٰذا عربی نے افکار کی تعبیر، ان کی تفہیم اور ان کی نشر واشاعت کا فریضہ بہتر طور سے انجام دیا۔ وہ ہندی، یونانی اور فارسی علوم کی منتقلی کا بہترین ذریعہ ثابت ہوئی۔ آٹھویں صدی ہجری کے اختتام تک تمام ثقافتوں کا خلاصہ

1- Priffault, Making of Humanity, pp 201, 202

عربی زبان میں سمٹ گیا۔ وہ عرب جو کل تک طب، ہندسہ اور ریاضیات کی مصطلحات سے یکسر نا آشنا اور منطق اور فلسفہ سے ناواقف تھے، تھوڑے ہی دنوں کے بعد اقلیدس کے دقیق نظریات، ارسطو کے فلسفے، جالینوس کی طب اور بطلیموس کی فلکیات کو عربی زبان میں منتقل کرنے لگے۔[1]

1- احمد امین، ضحی الاسلام، ج۱، ص ۲۰۵

عالمی ثقافت کے فروغ میں مسلم دانشوروں کا حصہ:

تراجم کے حوالے سے

مسلمانوں نے اپنے مفتوحہ ممالک میں علوم و معارف پر بھرپور توجہ دی، ترجمہ پر خاص دھیان دیا اور مترجمین پر بیت المال سے زر کثیر خرچ کیا تاکہ وہ اپنا کام دقت نظر اور اہتمام کے ساتھ انجام دے سکیں۔

خالد بن یزید بن معاویہ بن آل سفیان پہلے امیر تھے، جنھوں نے یونانی علمی ورثے کو عربی زبان میں منتقل کرنے کا حکم دیا۔ اس کے علاوہ جو علوم یونانی زبان سے قبطی زبان میں منتقل ہو چکے تھے، ان کو عربی میں منتقل کرنے کا اہتمام کیا۔ علوم و فنون کو عربی زبان میں منتقل کرنے کے سلسلے میں خالد بن یزید کو اولیت حاصل ہے۔ اسی طرح عربوں اور مسلمانوں میں سے جو لوگ اچھی عربی جانتے تھے، ان کے لیے علم کی ایک وافر مقدار مہیا ہو گئی۔[1]

شروع شروع میں ترجمہ کا کام بہت ہی مشکل اور پیچیدہ تھا۔ سلیس اور دقیق ترجمے کی بجائے لفظی ترجمہ ہوا کرتا تھا۔ ایسا اس لیے ہوتا تھا کہ مترجم نہ تو یونانی اور سریانی پر مکمل دسترس رکھتا تھا اور نہ عربی پر، لیکن آٹھویں صدی ہجری کے نصف اول کے بعد یا یہ کہہ لیجیے کہ

1- فاضل احمد الطائی، اعلام العرب فی الکیمیا، ص ۱۷

حنین بن اسحاق کے میدان میں اتر جانے کے بعد ترجمہ بالکل سلیس اور رواں ہوگیا۔عربی انھوں نے خلیل بن احمد الفراہیدی کے شاگردوں سے سیکھی اور بصرہ میں ان کے مدرسے میں تعلیم حاصل کی، پھر انھوں نے روم کا سفر کیا۔ کچھ دنوں وہاں قیام کر کے یونانی زبان پر قدرت حاصل کی۔ اس طرح وہ عربی اور یونانی دونوں زبانوں کے ماہر ہوگئے۔ چناں چہ اب تراجم فصیح وبلیغ، آسان اور دلکش پیرایۂ بیان میں لوگوں کے سامنے آنے لگے۔ وہ سریانی زبان بہت اچھی طرح جانتے تھے اس لیے انھوں نے سلیقے کے ساتھ ان علوم کو جو یونانی اور سریانی زبانوں میں تھے، عربی میں منتقل کر دیا۔ حنین بن اسحٰق کو عباسی خلفاء کی سرپرستی حاصل تھی۔ خاص طور سے مامون اس کے تراجم کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ وہ سبھی مترجمین کو کتاب کے برابر سونا اور چاندی عطا کرتا تھا۔[1]

دوسری صدی ہجری میں ایک عظیم عقلی تحریک پیدا ہوئی جس میں مختلف اسباب کارفرما تھے۔ ان میں سب سے اہم وہ عربی ثقافت تھی، جو شاعری، قرآن مجید، حدیث، فقہ اور عربی زبان سے متعلق علوم پر مشتمل تھی۔ تہذیب کے یہ تمام پہلو اس صدی میں خوب پھلے پھولے بلکہ ان میں سے بعض مختلف النوع اشیاء سے آراستہ ہوئے مثلاً نحو اور عروض۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں قدیم شعری ورثہ از سر نو مرتب ہوا۔

اس صدی کے شروع میں عربوں نے یونان کے علمی ورثے کو پڑھنا شروع کیا۔ درس وتدریس اور ترجمے کا کام ایک صدی سے زیادہ دنوں تک چلتا رہا۔ عرب علماء نے سائنسی علوم، فلسفہ اور علوم اجتماعیہ کا مطالعہ کیا اور علم ومعرفت کی زیادہ سے زیادہ صلاحیتیں اپنے اندر پیدا کیں۔ علم کے مختلف میدانوں مثلاً فلسفہ، فلکیات، طبعیات، ریاضیات، انجینیئرنگ اور کیمیا

۱۔ الأعلام، ج۲، ص۸۸-۲۸۷

کے میدان میں ان کی ایک بڑی تعداد ابھر کر سامنے آئی۔ انھوں نے ایک نیا اور مستحکم علمی ورثہ لوگوں کے لیے چھوڑا۔ ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے یونان کے علمی ورثے کو محفوظ رکھا اور اس سے بڑی بات یہ کہ علمی بحث وتحقیق کے نئے طریقوں کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن کر دیا۔ مثلاً علمی اور سائنسی میدان میں حقائق تک پہنچنے کے لئے وہ تجربہ پر یقین رکھتے تھے۔ یونانی اس طرز سے ناواقف تھے اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس کے بدلے فکری استنباط پر بھروسہ کیا ہے۔ شاید جابر بن حیان تجربات کی دنیا کا راہبر ہے، الکندی، ابن ہیثم اور دوسرے لوگوں نے ان کے نقش قدم کی اتباع کی ہے۔

علماء فارس نے ترجمہ کے میدان میں اہم کارنامے انجام دیے ہیں۔ مثلاً یعقوب بن طارق، محمد بن ابراہیم فزاری (اس کا باپ فلکیات کا مشہور عالم تھا، فلکیات پر اس کی ایک منظوم کتاب ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ پہلا مسلمان ہے جس نے ''اسطرلاب'' بنایا۔) پہلوی سے عربی ترجمے کے سلسلے میں عبداللہ بن المقفع کا نام ادبی دنیا میں کافی احترام سے لیا جاتا ہے۔ ابن المقفع نے منطق اور طب کی بعض کتابیں بھی عربی میں ترجمہ کی ہیں۔ لیکن کتاب ''خدائے نامہ'' یا سیر ملوک العجم سے اسے خاص طور پر شہرت ملی اور ان کی ایک کتاب کلیلہ ودمنہ بھی ہے۔ اس کے بیٹے محمد نے بھی یونانی فلسفہ کی کتابوں کا ترجمہ کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ عربی ادب کے اندر کلیلہ ودمنہ کو ایک خاص مقام حاصل ہے اور عالمی ادب میں بھی اسے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کتاب سے مؤلفین کی ایک بڑی جماعت متاثر ہوئی اور انھوں نے اس کے طرز پر لکھنا شروع کر دیا۔ ابن المقفع نے اس کتاب کے اندر حیوانوں کے کردار میں مختلف قصے عربی زبان میں داخل کیے اور انھیں کے الفاظ میں مختلف مثالیں، حکمتیں اور وعظ ونصیحت کو بیان کیا ہے۔

عالم اسلام کے اندر فارسی تہذیب کی ترویج واشاعت کی سب سے بڑی وجہ وزارتوں اور متعلقہ شعبوں کا فارسی نسل کے لوگوں کے پاس ہونا تھا۔ وزیر کے لیے ضروری ہوتا تھا کہ وہ جانکار اور صاحب قلم ہو۔تاکہ وہ ان مصنفین اور مستند کتابوں سے رجوع کرسکے جو علم ومعرفت کے اعتبار سے وسیع ہوں اور مختلف علوم وفنون پختگی کے ساتھ اس میں بیان ہوئے ہوں، فارسی ثقافتی ورثے کو عربی میں منتقل کرنے کے لیے یہ سارے احوال سازگار ثابت ہوئے۔عباسی سلطنت کے اندر برامکہ کو کافی اثر ورسوخ حاصل تھا۔ انھوں نے فارسی تہذیب وثقافت کی اشاعت میں کافی اہم کردار ادا کیا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ انھوں نے تمام ثقافتوں کی اشاعت کی حوصلہ افزائی کی۔فلکیات پر لکھی گئی ''مجسطی'' کی کتاب کا ذکر کرتے ہوئے ابن ندیم بیان کرتے ہیں کہ یحیی بن خالد برمکی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس کتاب کی تشریح وتعبیر اور عربی میں اس کے ترجمے کی طرف توجہ کی۔شروع دور کے مترجمین کی ایک جماعت نے اس کی تشریح کی لیکن اس کا حق ادا نہ کرسکے اور نہ ہی یحیی بن خالد برمکی اس سے مطمئن ہوئے لہذا پھر سے انھوں نے اس کام کی ذمہ داری بیت الحکمہ سے وابستہ ابو حسان اور سلمان کے حوالے کردی۔ انھوں نے اس کی تشریح وتفسیر کو بہتر طور پر انجام دینے کے ساتھ اس کے نوک پلک درست کرنے میں بھی کافی محنت کی۔ برامکہ اگرچہ فارسی تہذیب وثقافت کی طرف زیادہ توجہ دیتے تھے لیکن مگر انھوں نے ہندوستانی، یونانی اور عربی تہذیبوں کا بھی خیال رکھا۔

عربی زبان پر فارسی تہذیب کا اثر یہ پڑا کہ اس میں متعدد ایسے الفاظ شامل ہوئے جن کے بارے میں عربوں کو علم نہیں تھا کیونکہ وہ ایسے نئے معانی پیدا کرتے تھے جن کا تعلق راست طور پر اہل فارس سے تھا۔ان الفاظ کو خاص طور پر زینت کی اشیاء، کھانے کی اشیاء، مجلس کے آداب، موسیقی کے آلات، گھر کے نظام اور اس جیسی دوسری اشیاء میں واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح بہت سے الفاظ، عربوں سے میل جول اور باہمی تجارت کے ذریعہ،

دوسری زبانوں سے عربی زبان میں داخل ہوئے لیکن اگر ہم موازنہ کریں تو یہ سب الفاظ ان سے کم ہیں جن کا عربوں نے اپنی ضرورت کے لیے عربی میں ترجمہ کیا ہے۔

مسلمانوں کا کہنا تھا کہ دنیا میں چار ممتاز قومیں ہیں: ایرانی، ہندوستانی، رومی اور چینی۔ جاحظ کہتا ہے کہ ہندوستان ریاضی، علم نجوم، اسرار طب، نقشے اور بہت سی عجیب وغریب چیزیں بنانے میں مشہور تھا۔ ہندوستان کے بارے میں ایسی ہی باتیں قفطی اور اصفہانی جیسے مؤرخوں نے بھی کہی ہیں۔ ہندوستان سے مسلمانوں کا تعلق، یونان کے ساتھ ان کے خوش گوار روابط سے بہت پہلے ہی ہو چکا تھا۔ وہ ان سے ریاضیات کا علم بھی اخذ کر چکے تھے۔ منصور نے فلکیات پر لکھی گئی ایک ہندوستانی کتاب کا عربی میں ترجمہ کرنے اور ایک ایسی کتاب تالیف کرنے کا حکم دیا، جسے عرب ستاروں کی حرکتیں پہچاننے اور ان کا حساب رکھنے کے لیے استعمال کر سکیں، اس کام کو فزاری نے انجام دیا۔ عربوں نے ارکند اور ازجھری نام کی کتابیں بھی عربی میں منتقل کیں اور یہ ساری چیزیں اس بات کی گواہ ہیں کہ شروع شروع میں عربوں کے نزدیک علم فلکیات کی ترویج وترقی کے لئے ہندوستانی کتابیں کتنی زیادہ اہمیت کی حامل تھیں۔ فلکیاتی مسائل، جن کا تعلق ریاضی سے تھا عربوں نے ہندوستانیوں سے استفادہ کر کے حاصل کیے۔

اسی طرح عربوں نے ہندوستانیوں سے ریاضی کی بعض اصطلاحات بھی اخذ کی ہیں جیسے لفظ ''الجیب'' جسکا مثلث کے حساب میں استعمال کیا جاتا ہے، حساب و ہندسہ میں انہوں نے کثرت سے ہندوستانیوں کے نظریات کو قبول کیا ہے۔

شعر وادب میں ہندوستانیوں کا بڑا حصہ ہے۔ وہ ریاضیات وفلکیات کے قواعد کو نظم کا جامہ پہنا دیتے۔ اس سے ان کو ضبط قواعد اور دقت تعبیر سے الگ کر دیتی تھیں۔ ان کے یہاں شعر کے لیے اوزان و بحور مقرر تھے۔ البیرونی کہتا ہے کہ ممکن ہے کہ خلیل بن احمد نے اشعار کے اوزان وضع کرنے میں ہندوستانیوں کی تقلید کی ہو۔ عربوں کو ہندوستانی قصوں کا بہت شوق تھا

جیسا کہ ہم نے کلیلہ ودمنہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو پہلے فارسی میں تھی پھر عربی میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔ اسی طرح سے ایک ہندوستانی حکایت ''سند باد'' ہے، ابن ندیم نے الفہرست میں بہت ساری ہندوستانی کتابوں کا ذکر کیا ہے جو عربی میں ترجمہ کی گئی ہیں۔

عباسی خلیفہ مامون نے بغداد میں بیت الحکمت قائم کیا، جس میں ایک لائبریری اور فلکی رصدگاہ تھی۔ اس نے ماہرین فلکیات کو یہ حکم دے رکھا تھا کہ وہ ستاروں کی حرکات وسکنات کا پتہ لگانے کے لیے فلکیاتی جنتری ترتیب دیں اور زمین کی دونوں ڈگریوں کو ناپنے کا آلہ بنائیں۔ تاکہ زمین کے حجم کو پہلے سے زیادہ صحیح اور مناسب طور پر ناپا جاسکے۔ اسی طرح اس نے ماہرین سے یہ کہہ رکھا تھا کہ وہ ایک بڑا سا جغرافیائی نقشہ تیار کریں۔ گمان غالب یہ ہے کہ مشہور عالم محمد بن موسی خوارزمی مذکورہ زمین کی ڈگریاں ناپنے کا آلہ اور دنیا کا نقشہ بنانے میں پیش پیش رہا۔ زمینی اور فلکی دوریاں ناپنے کا آلہ تیار کرنے میں خالد بن عبدالملک مروزی، سند بن علی، علی بن عیسی اسطرلابی، یحیی بن ابی منصور اور دوسرے لوگ بھی شریک رہے۔ یہ وہی یحیی بن ابی منصور ہے جو مامون کی قائم کردہ فلکی رصدگاہ کا ذمہ دار تھا۔ علماء کی اس جماعت نے بغداد میں شماسیہ اور دمشق میں جبل قاسیون نامی جگہوں پر اپنے کارنامے انجام دیے۔ یہ زمانہ ۲۱۵، ۲۱۶ اور ۲۱۷ ہجری کا ہے۔

مامون کے عہد میں جن لوگوں نے بڑی عرق ریزی سے ترجمے کا کام انجام دیا، ان میں سے ایک نام یحیی بن ماسویہ کا ہے۔ یہ بغداد میں بیت الحکمت کا نگراں تھا۔ وہ سریانی اور عربی میں کتابیں لکھتا تھا۔ اسے یونانی زبان پر بھی قدرت حاصل تھی۔ اولیری (O' Leary) کہتا ہے کہ اس کی کتاب ''الطب عن الحمیات'' ایک زمانے تک مشہور رہی اور بعد میں اسکا عبرانی اور لاطینی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔[1]

۱- ڈیلس اولیری (Dalles O' Leary)، الفکر العربی ومکانہ فی التاریخ، ترجمہ ڈاکٹر تمام حسان، ص ۱۲۷

ترجمہ وتالیف کی علمی تحریک مأمون کے عہد میں پروان چڑھی اور اس عہد میں اسے خوب فروغ حاصل ہوا۔ اسی کے زمانے میں عرب فلسفی ابو یوسف یعقوب کندی نے اپنی فکری سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ کارل بروکلمان (Carl Brockelmann) کہتا ہے کہ ابو یوسف نے ترجمے کے ذریعے ارسطو اور افلاطون کے فلسفے سے اپنے ہم وطنوں کو متعارف ہی نہیں کرایا بلکہ اس فلسفہ کی رو سے اس نے طبیعی تاریخ اور فضائی حقائق کا مطالعہ بھی کیا اور اس پر کتابیں بھی تالیف کیں، جس سے عربوں کی عقلی وسعتوں میں اضافہ ہوا۔

مامون کی علمی سرگرمی کتابوں کو خریدنے اور ترجمہ وتالیف کی حوصلہ افزائی ہی تک محدود نہیں تھی بلکہ وہ یہ بھی کوشش کرتا تھا کہ غیر ملکی علماء بغداد آئیں تاکہ ان کی مہارت اور تجربے سے استفادہ کیا جائے۔[1]

عباسی عہد میں عربوں کے اپنی زبان پر قائم رہنے کی وجہ سے تیسری، چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں ایسے مصنفین پیدا ہوئے جنھوں نے علم وادب اور فن پر ہمارے لیے ایک وقیع ذخیرہ چھوڑا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ عربی زبان اس زمانے میں ترقی کی منزلیں طے کر رہی تھی اور دوسری بے شمار تہذیب وثقافت کو اپنے اندر سمو رہی تھی کیونکہ عربی زبان میں انسانی جذبات واحساسات کی تعبیر کے لیے بے شمار مترادف الفاظ تھے۔ جب عربوں کو علم طبیعیات اور علم ریاضیات کو عربی میں منتقل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو انھوں نے مصطلحات کو عربی میں منتقل کیا اور یہ زبان کا ایک جز بن گئیں۔ یہ ایک واضح اور قطعی دلیل ہے کہ عربی زبان زندہ تہذیب وثقافت کی زبان ہے۔[2]

1۔ محمد مصطفیٰ ہدارہ، المامون الخلیفۃ العالم، ص ۱۱۶

2۔ تفصیل کے لئے امام سیوطی کی کتاب ''الاکلیل فی استنباط التنزیل'' رجوع کریں۔ (تصحیح شدہ نسخہ)

اسلام ایک خاص تہذیب اور علمی نظریہ کا نام ہے جس کی طرف قرآن اشارہ بھی کرتا ہے اور اسے بیان کرنے کے ساتھ اس کی طرف رہنمائی بھی کرتا ہے۔ قرآن کے اندر علمی اعجاز بالکل عیاں اور ظاہر ہیں، سائنسی ترقی ہمارے سامنے ایسے حقائق پیش کرتی ہے جس کی طرف قرآن نے پہلے ہی اشارہ کر دیا ہے۔ اللہ تعالی کا یہ قول: ﴿کتاب انزلناه الیك مبارك لیدبروا آیاته ولیتذکر أولوا الألباب﴾ (سورة ص:۲۹)

''یہ نہایت مبارک کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے تا کہ لوگ اس کی آیات پر تدبر کریں اور صاحب عقل اس سے یاد دہانی حاصل کریں''۔

شرعی نقطۂ نظر سے قرآن نے ایک عمدہ اور باوقار تہذیب وثقافت ہمارے سامنے پیش کی ہے جو ہر ماحول اور ہر زمانے سے مناسبت رکھتی ہے۔ دنیا کے جدید قوانین، اقتصادی اور اجتماعی نظریات کے اصول ومبادی، اسلامی شریعت میں پہلے سے موجود ہیں۔ قرآن مجید میں سائنسی آیتوں کی تعداد تقریبا ۷۵۰ ہے جو مختلف علوم پر مشتمل ہیں۔ ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں کوئی ایسا علم نہیں جس کی طرف قرآن نے اشارہ نہ کیا ہو۔ اس سلسلے میں قرآن ایسی باتیں کہتا ہے جو سائنسی اعجاز اور بشری طاقت سے بالاتر ہیں۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿فلینظر الانسان مما خلق. خلق من ماء دافق یخرج من بین الصلب و الترائب﴾ (سورہ الطارق:۵-۷)

''انسان غور کرے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے؟ وہ پیدا کیا گیا ہے ذرا سے اچھلتے پانی سے جو نکلتا ہے ریڑھ اور پسلیوں کے بیچ سے''۔

الصلب: ریڑھ کی ہڈیاں، الترائب: پسلیاں ہیں۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿یخلقکم فی بطون أمهاتکم خلقا من بعد خلق فی ظلمات ثلاث﴾ (سورۃ الزمر:٦)

''وہ تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں پیدا کرتا ہے۔ایک خلقت کے بعد دوسری خلقت میں، تین تاریکیوں کے اندر۔''

دور جدید میں علم جنین کا ایک مقرر اصول ہے کہ جنین بن جانے کے بعد وہ تین مضبوط پردوں سے ڈھکا ہوتا ہے۔نہ تو اس میں پانی جاتا ہے، نہ روشنی اور نہ حرارت۔

اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿أولم یر الذین کفروا أن السموات و الأرض کانتا رتقا ففتقناهما و جعلنا من الماء کل شیء حی أفلا یؤمنون. و جعلنا فی الأرض رواسی أن تمید بهم و جعلنا فیها فجاجا سبلا لعلهم یهتدون. و جعلنا السماء سقفا محفوظا و هم عن آیتها معرضون. و هو الذی خلق اللیل و النهار و الشمس و القمر کل فی فلك یسبحون﴾ (الانبیاء: ۳۰-۳۱)

کیا ان کفر کرنے والوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ آسمان اور زمین دونوں بند ہوتے ہیں، پھر ہم ان کو کھول دیتے ہیں۔اور ہم نے پانی سے ہر چیز کو زندہ کیا تو کیا وہ پھر بھی ایمان نہیں لا رہے ہیں؟ اور ہم نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے کہ وہ ان کو لے کر لڑھک نہ جائے اور ان پہاڑوں کے اندر ہم نے راستہ کے لیے درے بنائے تاکہ وہ راہیں پائیں''۔

یہ واضح آیات کائنات کی پیدائش، اس کے پھیلاؤ، اس کی مسلسل وسعت اور زمین و آسمان کی تخلیقی کیفیات سے متعلق ہیں۔اصلاً یہ تمام اشیاء اللہ کے دنوں میں سے کسی دن ایک تھیں، جو دھوئیں کی شکل میں ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو اسی دن پھٹنے اور الگ ہونے کا حکم دیا۔علاحدہ اور جمع ہونے کا عمل دو دنوں میں ہوا۔اس دوران اللہ نے کائنات اور آسمان و زمین کو اپنی منشا اور قدرت کے مطابق تیار کر دیا۔

علم خلیہ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پانی خلیوں کو بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کرتا

ہے۔ یہ کائنات کی ہر زندہ چیز میں ہے، چاہے نباتات ہوں یا حیوانات۔ ان تمام میں خلیہ ایک ہی طریقے سے بنتا ہے۔ نشو ونما سے متعلق علم کیمیا سے ثابت ہے کہ جسم کے اندر ہر عمل اور ہر تبدیلی کے لیے پانی ضروری ہے۔ یا تو اس کا کردار مرکزی ہوگا یا عمل میں مددگار شے کی حیثیت رکھتا ہوگا یا پھر عمل اور تخلیق میں بذات خود داخل ہوگا۔ وہ علم جو اعضاء کے کام کرنے سے متعلق ہے اس سے ثابت ہے کہ اعضاء کو اپنے کام انجام دینے کے لیے پانی کی ضرورت ہے۔ اعضاء کے کام کے بغیر زندگی کے ظاہر و باطن بے معنی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ وانزلنا الحديد فيه بأس شديد و منافع للناس ﴾ (سورہ حدید: ۲۵) اور ہم نے لوہا بھی اتارا، جس میں بڑی قوت بھی ہے اور لوگوں کے لیے اس میں دوسرے فوائد بھی ہیں۔

کوئی دوسری شئے اس سے زیادہ مدلل انداز میں لوہے کی امتیازی خصوصیت، اس کے تنوع اور حرارت وشدت، زنگ، آلودگی اور بوسیدگی کے لحاظ سے اس کی مختلف قسموں کو نہیں بتا سکتی۔ اتنی ساری خاصیت کی وجہ سے جنگی ہتھیاروں اور دوسرے آلات، چھوٹی اور بڑی ہر قسم کی صنعتوں اور ثقافتوں کا ستون بننے کے لیے وہ سب سے زیادہ مناسب دھات ثابت ہوا۔

زندہ مخلوق کے لیے لوہے سے بہت سارے فائدے ہیں، جب لوہے کے مرکبات کلوروفل کے بنانے کے عمل میں داخل ہوتے ہیں تو یہ بنیادی مادہ تمثیل ضوئی کے عمل میں مددگار ثابت ہوتا ہے جس سے نباتات سانس لیتے ہیں اور جس سے ہمارے پروٹو پلازم زندہ رہتے ہیں اور اسی کے سہارے انسانی وحیوانی اجسام میں لوہا داخل ہوتا ہے۔ لوہا جگر، تل، گردہ، پٹھوں اور سرخ بلغم میں موجود ہوتا ہے۔ انسانی جسم کو لوہے کی ایک مقدار درکار ہوتی ہے جسے مختلف ذرائع سے حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے اگر اس کی مقدار انسانی جسم میں کم ہو جائے تو انسان

مختلف امراض میں مبتلا ہو جاتا ہے، جس میں سب سے اہم خون کی کمی کا مرض ہے۔[1]

اس کے علاوہ اگر آپ ان آیات پر نظر ڈالیں جو نفسیاتی اور کائناتی موضوعات سے بحث کرتی ہیں تو پتہ چلے گا کہ علم طبیعیات، فلکیات، علم طب، علم وراثت، علم تاریخ اور علم جغرافیہ جیسے بہت سے علوم ہیں۔ ایک محقق اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ قرآن تمام علوم سے بحث کرتا ہے اور یہ قیامت تک کے علوم کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

زمانہ بعید سے ہی قرآن کی مختلف تفسیریں اور ترجمے ہوتے رہے ہیں۔ سائنسدانوں نے قرآن میں مذکور علوم و معارف اور دقیق نظریات کو قرآنی تراجم کے ذریعہ جانا۔ شاید بحث و تحقیق میں قرآن نے ان کی رہبری بھی کی ہو اور بہت سے امور میں مختلف جہتوں سے حقائق کی طرف پہنچنے میں معاون و مددگار بھی ثابت ہوا ہو۔

مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں علم و ثقافت کا بہت اہتمام کیا اور اس میں انھیں ہر طرف سے کامیابی ملتی رہی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ انہوں نے تراجم کے ذریعہ دنیا کو محفوظ کر لیا۔ دنیا کی تہذیب و ثقافت صفحۂ ہستی سے مٹ چکی ہوتی اگر ان کا عربی میں ترجمہ نہ ہوا ہوتا۔ اس دوران ان کو صرف عربی کتابوں کے ذریعہ جانا جاتا ہے۔ ارشمیدس کی کتاب ''القوی المحرکۃ''، ''الریاضیات'' اور ''الاجسام الطائفیہ'' اور بطلیموس کی کتاب ''البصریات'' خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اگر ثقافتوں کو زندہ رکھنے اور ان کی ترویج میں مسلمانوں کا اخلاص اور ان کی رغبت شامل نہ ہوتی تو پرانی ثقافتیں مر کر دفن ہو چکی ہوتیں۔ مسلمانوں نے اور دوسرے بہت سے میدانوں میں کمال حاصل کیا جن میں ان کی الگ ثقافتی شناخت تھی۔ ایسا اس وجہ سے ہے کہ قرآن نے انہیں کائنات کے رموز و اسرار پر غور و فکر کی ہدایت کی ہے۔ مسلمانوں نے علم

1۔ المنتخب فی تفسیر القرآن الکریم، قاہرہ ۱۳۸۷ھ، ص ۸۰۸

فلکیات، علم کیمیا، علم طب، علم تشریح، علم جراحت جیسے دوسرے علوم میں کارہائے نمایاں انجام دیے اور اسی طرح انھوں نے الجبراء اور حساب کے عدد بھی ایجاد کیے۔ اس کے علاوہ انھوں نے وقت کا پتہ لگانے کا طریقہ معلوم کیا اور اس سے متعلق بہت سارے آلات ایجاد کیے۔ یہ سب کچھ انھوں نے ترجمے کے ذریعہ قدیم ثقافتوں کو زندہ اور محفوظ رکھتے ہوئے کیا۔

تہذیب وتمدن پر اسلامی ثقافت کے اثرات

اسلامی تہذیب جن مختلف راستوں سے یورپ تک پہونچی ان میں سے چند اہم درج ذیل ہیں:

(۱) اندلس

عربوں نے اندلس میں اعلیٰ درجہ کی یونیورسٹیاں قائم کیں۔ ان یونیورسٹیوں میں یورپ کے طلبہ نے تعلیم حاصل کی اور پھر اسے اپنے ملک میں عام کیا۔ اسی طرح یورپ نے اسپین میں موجود بہت سی علمی کتابوں سے بھی استفادہ کیا۔ بعد میں یہ تمام چیزیں یورپ کے احیاء علوم میں ممد ومعاون ثابت ہوئیں۔

(۲) سسلی

اس ملک میں مسلمانوں نے ۱۳۰ سال تک حکومت کی۔ لہٰذا سسلی یورپ میں اسلامی ثقافت کے نشر واشاعت کا دوسرا اہم مرکز تھا۔

(۳) مشرق

صلیبی جنگوں (۱۰۹۹-۱۲۹۱) اور بیت المقدس کی زیارت نے یورپ کو عربوں سے ملنے کا موقع فراہم کیا۔ یورپ کے لوگوں نے عربوں کے علوم ومعارف اور صنعت وحرفت کو اپنے یہاں منتقل کیا۔ ان سے بہت سی کتابیں حاصل کیں نیز متقدمین کے علوم وفنون اور ان

کے اصول وآداب کا مطالعہ کیا۔ان بنیادوں پر تحقیق کر کے ان کو کافی فروغ حاصل ہوا۔

انصاف پسند مغربی دانشور تسلیم کرتے ہیں کہ اہل یورپ مسلمانوں سے ملنے کے بعد ہی علم کی روشنی سے منور ہوئے۔انھوں نے مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کا بغور مطالعہ کیا اور اس سے نہ صرف اپنی جہالت کی تاریکی ختم کی بلکہ علمی ترقی کی اس معراج کو پہونچ گئے جس کے سائے میں آج یہ جی رہے ہیں۔اگر یورپ علم وآگہی سے ہمکنار نہ ہوا ہوتا تو شاید مزید کئی صدیوں تک عہد وسطی کی طرح تاریکی اور جہالت میں ڈوبا رہتا۔فرانسیسی مورخ گستاؤلیبان (Gustave Le Bon) اپنی کتاب ''حضارۃ العرب'' (تمدن عرب) [1] میں لکھتا ہے:

> ''اہل مغرب پر اسلامی تہذیب کا بہت اثر ہے۔یورپی تہذیب اسلامی تہذیب کی مرہون منت ہے۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ: اس تہذیب کے اثرات یورپ کے سائنسی،ادبی اور اخلاقی علوم پر بہت نمایاں ہیں۔مغرب پر عربوں کے ان عظیم اثرات کا ہم اس وقت تک تصور نہیں کر سکتے جب تک ہم یورپ کے اس زمانے سے واقف نہ ہوں جب وہ تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا''۔

گستاؤلیبان (Gustave Le Bon) مزید کہتا ہے کہ:

> ''یورپ کے عہد وسطی میں جہالت کا زمانہ طویل ہے۔جب کچھ روشن دماغوں کو یورپ سے جہالت ختم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے عربوں کے دروازے پر دستک دی۔وہ اپنی ضرورت کے مطابق عربوں سے علم کے طلب گار ہوئے۔گویا کہ وہ اس زمانیمیں تنہا علم کے سردار تھے''۔

گستاؤلیبان (Gustave Le Bon) کا کہنا ہے کہ اندلس، سسلی اور اٹلی کے ذریعہ یورپ علم سے متعارف ہوا۔صدر پاپائے ریمولہ (Rimolh) کی عنایت سے اندلس کے

---

[1]- گستاؤلیبان (Gustave Le Bon)،ص ۲۶و ۵۶۸

شہر طلیطلہ میں ترجمے کے لیے ۱۱۲۰ء میں ایک مدرسہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس مدرسے میں مسلمانوں کی مشہور تصانیف کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا جانے لگا۔ اس وقت صرف امام رازی، ابن سینا اور ابن رشد وغیرہ ہی کی تصانیف کا ترجمہ نہیں کیا گیا بلکہ یونان کی ان کتابوں کا بھی ترجمہ کیا گیا جس کو عربوں نے اپنی زبان میں منتقل کر لیا تھا۔ گستاؤلیبان (Gustave Le Bon) کہتا ہے کہ عربوں نے قدیم یونانی ورثہ کی حفاظت کر کے مغرب پر بڑا احسان کیا ہے۔

''یہ فضل واحسان صرف تنہا عربوں ہی کا ہے کہ انھوں نے قدیم علوم کو متعارف کرایا۔ عہد وسطی کے پادریوں کا اس میں کچھ بھی حصہ نہیں کیوں کہ وہ یونانی زبان کے وجود سے بھی ناواقف تھے۔ یہ دنیا تا قیامت اس قیمتی خزانے کی حفاظت کے بموجب عربوں کی احسان مند رہے گی۔ مغرب کی یونیورسٹیاں پانچ صدی تک عربوں کی تصانیف کے سوا کسی دوسرے علمی تراجم سے متعارف نہ ہوئیں۔ یہی عرب ہیں جنہوں نے یورپ کو مادی، عقلی اور اخلاقی طور سے آرستہ و پیراستہ کیا۔ تاریخ ایسی مثال دینے سے قاصر ہے کہ اتنی کم مدت میں عرب قوم نے دنیا کے سامنے وہ کچھ پیش کیا جو دوسروں نے نہیں کیا۔ اس انوکھے کارنامے کے سبب کوئی قوم عرب پر فوقیت نہیں رکھتی۔

مفتوحہ ممالک میں اسلام اور اسلامی تہذیب کے اثرات کے متعلق گستاؤلیبان (Gustave Le Bon) کہتا ہے:

> ''عربوں کے اثرات ان ملکوں کی تہذیب پر زیادہ ہیں جن کو انھوں نے فتح کیا۔ شاید فرانس کو بھی اس کا تھوڑا سا حصہ ملا ہے۔ ہم نے ان ملکوں کی صورت بدلتے دیکھی ہے جہاں رسول ﷺ کا جھنڈا لہرایا۔ ان ممالک میں علم وفن، ادب، صنعت اور زراعت بام عروج کو پہونچ گئے''۔

گستاؤلیبان (Gustave Le Bon) ان مفتوحہ ملکوں میں علوم کی نشر واشاعت اور

یونیورسٹیوں کے قیام میں عربوں کے فضل وکمال کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ عربوں نے علوم وفنون کی ترقی میں بخل سے کام نہیں لیا بلکہ اسے عام کرنے میں بھرپور دلچسپی لی۔انھوں نے یونیورسٹیاں قائم کیں اور کتابیں تالیف کیں۔اس پہلو سے بھی یورپ پر عربوں کا بڑا اثر ہے۔ عرب نے صدیوں تک مسیحی قوم کی رہنمائی کی۔اگر عربوں کا فضل نہ ہوتا تو ہم روم اور قدیم علوم سے واقف نہ ہوتے۔یہی وجہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیاں تعلیم کے میدان میں عربوں کی تصانیف کو اپنی زبان میں منتقل کرنے سے بے نیاز نہ رہ سکیں۔[1]

فرانسیسی فلسفی ''رینہ جینوت'' (Rene' Genot) جنھوں نے اسلام قبول کرکے اپنا نام عبدالواحد یحییٰ رکھا ہے، کہتے ہیں ''یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ مسلمانوں کے ثقافتی اثرات یورپ تک محیط ہیں۔یہ وہ عربی الاصل الفاظ ہیں جو افکار کو منتقل کرنے اور مافی الضمیر کی ادائیگی میں سب سے بہتر ہیں۔اسلامی افکار کی منتقلی سے ہم نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔حقیقت میں اسلامی تہذیب کے اثرات بہت دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ان اثرات کو تمام علوم وفنون اور فکر وفلسفہ وغیرہ میں واضح طور سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔اندلس اس تہذیب کے فروغ کا سب سے اہم مرکز تھا۔کیمیا نے اپنے عربی نام کو محفوظ رکھا۔علم فلکیات اور اس کی اکثر اصطلاحیں اب بھی اپنی عربی اصل کے ساتھ تمام یورپی زبانوں میں محفوظ ہیں۔اس طرح ہر قوم کے ماہر فلکیات اکثر ستارے کو عربی نام سے پکارتے ہیں۔یہ واضح کرنا ہمارے لیے نہایت آسان ہے کہ جغرافیہ کی اکثر اصطلاحیں ان عرب سیاحوں نے وضع کیں جنھوں نے پوری دنیا کی سیر کی۔انہوں نے اصطلاحات کے ساتھ بہت سی جغرافیائی معلومات میں بھی اضافہ کیا۔اسی طرح علم ریاضی میں بھی واضح طور سے اسلامی ثقافت کے اثرات پائے جاتے

۱۔ گستاؤلیبان (Gustave Le Bon) ص۵۶۹-۲۶-۲۶

ہیں۔علم حیوانات عربی نام ہی کے ساتھ مغرب میں منتقل ہوا۔حسابی اعداد جسے اہل یورپ استعمال کرتے ہیں وہی اعداد ہیں جسے عربوں نے استعمال کیا تھا اور اکثر معانی جنہیں مسلم انشاء پردازوں اور شعراء نے استعمال کیا، مغربی ادب نے بھی اسے اپنے ادب کا حصہ بنایا۔عہد وسطی کے فن تعمیر میں بھی اسلامی ثقافت کے اثرات نمایاں ہیں۔

یورپ کے پاس یونانی فلسفہ کو جاننے کا اسلامی ثقافت کے سوا کوئی دوسرا وسیلہ نہیں تھا کیونکہ افلاطون اور ارسطو کی لاطینی کتابوں کا ترجمہ پہلے عربی میں ہی ہوا اور یورپ نے ان کا براہ راست یونانی سے ترجمہ نہیں کیا بلکہ عربی تراجم سے ترجمہ کیا اور ابن رشد، ابن سینا جیسے مسلم دانشوروں نے اسلامی فلسفہ میں جو کچھ لکھا تھا اس میں اضافہ بھی کیا۔

ریذیہ جینوت (Rene' Genot) اپنی بات اس قول پر ختم کرتا ہے کہ مغرب کے گوشہ گوشہ میں اسلامی ثقافت کے اثرات ہیں لیکن مغرب اس کا اقرار کرنا نہیں چاہتا اور نہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اسے مشرق کی برتری اور فضیلت کا اعتراف کرنا پڑے لیکن زمانہ حقیقت کے اظہار کے لیے کافی ہے۔[1]

یورپ پر اسلامی ثقافت کے اثرات گہرے ہیں اور یہ زندگی کے مختلف گوشوں کو محیط ہیں۔یہ اثرات علوم ومعارف اور فنون پر بھی نمایاں طور سے دیکھے جاسکتے ہیں۔

۱-ادب:

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ چودھویں صدی اور اس کے بعد کے ادوار میں، عربی ادب اور اسلامی ثقافت کے موضوعات سے، یورپ کے عبقری شعراء کی ایک جماعت کا مضبوط ترین رشتہ قائم ہوا۔ہم یہاں بوکاشیو (Bokashio)، پتراک (Petrak) اور دانتے

۱- ڈاکٹر عبدالحلیم محمود: رینہ جینوت (Rene' Genot)، ص ۶۰-۵۰

(Dante) کا خاص طور سے ذکر کرتے ہیں جن کا شمار اٹلی کی نشاۃ ثانیہ کے سربرآوردہ لوگوں میں ہوتا ہے۔ مشہور انگریزی انشا پرداز شسر (Chaucer)، اسپینی سرفانتیس (Serphantis) کا یورپ کے نشاۃ ثانیہ میں نمایاں حصہ ہے۔ ۱۳۴۶ء میں بوکاشیو (Bokashio) نے اپنی کہانیاں لکھیں۔ جس کا نام "دس راتیں" رکھا۔ ان کہانیوں میں بوکاشیو (Bokashio) نے الف لیلہ ولیلہ کی پیروی کی ہے، جس کی کہانیاں اس زمانے میں مصر اور شام میں رائج تھیں۔ اس نے اپنی کتاب میں الف لیلہ ولیلہ کے طرز پر سو کہانیاں شامل کی ہیں۔ اس میں سات کو عورتوں اور ۳ کو مردوں کی طرف منسوب کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اوپر یہ بات واجب کی کہ وہ صبح میں ہر روز خالی وقت گذارنے اور بوریت کو ختم کرنے کے لیے ایک کہانی سنائے گا۔ اس وقت یورپ میں ایسی کہانیوں کا رواج بہت زیادہ تھا۔ مشہور انگریزی ادیب ولیم شکسپیر (William Shakespeare) نے اپنے ڈرامہ "انگھوٹی سے عبرت" کا موضوع انہی کہانیوں سے لیا ہے۔ اسی طرح جرمن ادیب لیسینگ (Lessing) نے اپنے ڈرامہ "ناتان حکیم" بھی انہی کہانیوں سے اخذ کیا ہے۔ انگریزی زبان کے جدید شاعروں کا امام شسر (Chaucer) بوکاشیو کے (Bokashio) سے سب سے زیادہ اقتباسات لینے والوں میں سے ہے۔ کیونکہ اٹلی کی زیارت کے دوران شسر (Chaucer) بوکاشیو (Bokashio) سے ملا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنا سب سے مشہور قصہ "قصص کانتر بری" کو نظم کیا۔

دانٹے (Dante) کا اسلامی ثقافت سے گہرا رشتہ تھا کیونکہ فردریک ثانی (Friedrich II) کے زمانے میں وہ سسلی رہ چکا تھا۔ اپنے قیام کے دوران اس نے اصل عربی مصادر سے اسلامی ثقافت کا مطالعہ کیا۔ ایک مستشرق کا کہنا ہے کہ صوفی محی الدین بن عربی (۱۱۶۴-۱۲۴۰) کی کتاب "الفتوحات المکیۃ" اور دانٹے (Dante) کی الٰہی کومیڈی کے

درمیان جنت کے جن اوصاف کا ذکر ہے، وہ ایک دوسرے سے بہت زیادہ مشابہ ہیں۔

رسول ﷺ کی سیرت کے بارے میں دانتے (Dante) کو غیر معمولی علم تھا۔ غالباً یہ اسراء، معراج اور آسمانی مراتب کے بارے میں انہی ذرائع سے واقف ہوا۔ ابوالعلاء معری کی کتاب ''رسالۃ الغفران'' سے بھی آگاہ ہوا۔ الٰہی کومیڈی میں دوسری دنیا کے متعلق جو معلومات ہیں وہ انہیں مصادر سے لئے گئے ہیں۔ اپنی قوم سے سب سے زیادہ اقتباس نقل کرنے والا عالم پروفیسر آسین بلاسیس (Asin Palacious) ہے۔

اسلامی ثقافت کے زمانے میں پتراک (Petrak) اٹلی اور فرانس میں مقیم تھا اور فرانس کی دو یونیورسٹیوں مونبلیہ اور پیرس یونیورسٹی سے علم کی پیاس بجھائی۔ ان دونوں یونیورسٹیوں کو اندلسی یونیورسٹیوں کے مسلم علماء کے شاگردوں نے قائم کیا اور ان کی سرپرستی بھی کی تھی۔ الجزائر میں سرفانتیس (Serphantis) کئی سال رہا اور اس نے ایک کتاب ''دون کیشوت'' تالیف کی۔ اس کتاب میں جو اسالیب استعمال ہوئے ہیں۔ ان میں ہر قاری محسوس کر سکتا ہے کہ ان میں ان عربی محاوروں اور کہاتوں کا استعمال کثرت سے ہے جو ان دنوں عرب میں رائج تھے۔ پرسکولٹ (Prescolt) جسے اپنی تاریخ پر دسترس حاصل ہے، کا کہنا ہے کہ ''دون کیشوت'' کا اسلوب خوش طبعی اور شگفتگی میں بالکل اندلسی ہے۔

رہی شاعری کی بات تو دانتے (Dante) کا کہنا ہے کہ سسلی میں اٹلی کی شاعری کا وجود ہی عربی شاعری کے طفیل ہوا۔ جنوب فرانس کے بروفانس صوبہ میں عامیہ شاعری کا رواج تھا۔ اس صوبہ میں شاعری ان سیاح شعراء کے ذریعہ عام ہوئی جو تروبادور کے نام سے جانے جاتے تھے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ یورپ کے لوگوں نے یہ نام عربی طروب کے لفظ سے نکالا ہے۔ اندلس کے شمال میں یورپ کی شاعری میں عربی الفاظ اور اسلامی عادات و اطوار کے اشارات

پائے جاتے ہیں۔ موشحات اور زجل میں اندلسی عربی شاعری کا سبب بذات خود اپنی شاعری کا ارتقاء ہے۔ غالباً موشح کی ایجاد مقدم بن معافی القبری الضریر ۹۹۲م کے ہاتھوں ہوئی۔ دوسرے تین لوگوں نے اسے نظم کا رنگ دے دیا۔ کیونکہ اسے سہل الممتنع بنانے میں وہ اس پر اپنے نقش چھوڑ گئے۔ اس بات کا اعتراف ابن خلدون نے اپنی کتاب ''مقدمہ ابن خلدون'' میں کیا ہے۔

عام طور سے زجل عربی کی عامیہ کی زبان میں ہوتا ہے جب کہ موشح فصیح عربی زبان میں۔ نظم کے یہ دونوں رنگ اہل اندلس کی ایجاد ہیں۔ زجل اور موشح نے یورپ کی شاعری کی ترقی میں اپنا اثر چھوڑا ہے۔ محققین نے اس بات کا ثبوت فراہم کیا ہے کہ اندلسی شاعری کے بحر واوزان اور عربی موسیقی، یورپ منتقل ہوئے۔

یورپ کی شاعری کے بعض موضوعات مثلاً: مہم جوئی، اور اس جیسے دوسرے موضوعات پر عربی اثرات مکمل طور سے نمایاں ہیں۔ اسی طرح پاک محبت کے افکار وخیالات میں بھی عربی شاعری کے اثرات بہت واضح ہیں۔ یہ تمام چیزیں بروفسال (Brovsal) کی غزل میں کارفرما ہیں۔ کیوں کہ ان کی شاعری اندلسی شاعری اور ابن قزمان کی زجل کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔ ابن حزم نے اپنی کتاب ''طوق الحمامۃ'' میں حب العذری کے افکار سے بحث کی ہے۔

یورپی افسانوں پر بھی عہد وسطی کے افسانوں اور فنون لطیفہ کے نقوش مرتسم ہیں جیسے مقامات، شہسواری کے قصے، بہادری کی صفات اور محبت اور شرافت کے حصول کے لیے مہم جوئی جو عربوں کے یہاں معروف تھی۔

یورپ کے ناقدوں کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ گولیفر (Gulliver) کا سفرنامہ جسے

سوئفت نے تالیف کیا اور روبنسن کروز (Robinson Cruz) کا سفرنامہ جے دافوی (J. Dafoe) نے تالیف کیا یہ دونوں الف لیلہ ولیلہ کے قصے اور حی بن یقظان کے رسالۃ جسے مسلم اندلسی فلسفی ابن طفیل نے تالیف کیا، کے مرہون منت ہیں۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ ۱۲ ویں صدی کے پہلے حصے میں یورپی زبانوں میں الف لیلہ ولیلہ کے ترجمہ نے یورپ کے ادب پر نمایاں اثر اور ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

آج بھی ادب اسلامی اور یورپ کے جدید ادب کے درمیان رشتہ منقطع نہیں ہوا ہے۔ اثرات کو واضح کرنے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ ادب اسلامی یورپ کے ادب میں آج بھی زندہ ہے کیونکہ ہم کوئی ایسا بڑا ادیب یا شاعر نہیں پاتے جو اپنے آپ کو اسلامی شجاعت اور اسلامی نوادر کی طرف اشارہ کیے بغیر اپنی شاعری اور اپنی نثر کو آزاد کر سکے۔ ان انگریز ادباء میں شکسپیر (Shakespeare)، اڈلیس (Ades)، بایرون (Byron)، سوری (Souri)، کولردج (Coleridge)، شیلی (Shely) وغیرہ اور جرمن ادباء میں جیتھ (Jeth)، ھرور (Horror)، لیسینغ (Lessing) اور فرانسیسی ادباء میں: والتیر (Walter)، لافوتین (Lafontaine) وغیرہ ہیں۔ لافوتین (Lafontaine) نے اعتراف کیا ہے کہ اس نے اپنے افسانے میں کلیلہ ودمنہ کی اقتداء کی ہے جسے مسلمانوں نے یورپ میں متعارف کرایا ہے۔

۲۔ فلسفہ:

یورپ کے عظیم فلسفیانہ افکار پر مسلمانوں کے گہرے اثرات ہیں۔ اسپین، مغرب کے یورپی افکار پر اسلامی فلسفے کے اثرات کا مرکز تھا۔ کیوں کہ یورپ اندلس کے واسطہ سے مشرقی فلسفیوں سے واقف ہوا۔ طلیطلہ کے اسقف اعظم ریمنڈ (Raymond) نے فارابی، ابن سینا اور غزالی وغیرہ کے کارہائے نمایاں کے ترجمے کی نگرانی کی۔ عربوں نے ہی یونان کے عظیم

فلسفیوں کے فلسفے اور ان کی کتابوں خصوصاً ارسطو کی کتاب کی حفاظت کی اور اس عظیم ورثے کو مغرب تک پہنچایا۔ عربی افکار سے یورپی علم معقولات کے ربط نے ہی انہیں مجبور کیا کہ وہ یونانی فلسفے کا مطالعہ کریں۔

روجر بیکون (Roger Bacon) اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ ارسطو کے اکثر فلسفے کے مخطوطات کے ضائع ہو جانے کے سبب ہی مغرب ان کے فلسفے سے لاعلم رہا۔ مسلم فلسفیوں نے ارسطو کے فلسفے کا ترجمہ کیا۔ اس کی شرح کی اور لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

اندلسی فلسفیوں میں جنہوں نے یورپ کے افکار پر ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں، ان میں ابن باجہ، ابن طفیل اور ابن رشد قابل ذکر ہیں۔

ابن رشد کو ارسطو کے فلسفے کا عظیم شارح اور مفسر مانا جاتا ہے۔ میخائیل سکوت (Michael Scott) پہلا شخص ہے جس نے ۱۲۳۰ء میں ابن رشد کے فلسفے سے یورپ کو متعارف کرایا۔ تیرہویں صدی کے نصف تک اس عظیم فلسفی کی تمام کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کردیا گیا۔ پندرہویں صدی کے نصف تک ابن رشد اٹلی کے بارو کالج میں مسلمہ طور پر ایک عظیم معلم بن گیا تھا۔[1] مغربی فلسفیوں کی ایک بڑی جماعت کو کنیسہ کی تعلیم، آزادانہ افکار سے لگاؤ اور تجربہ اور مشاہدہ کی بنیاد پر عقل کے فیصلے سے باہر نکالنے میں ابن رشد کی تحریروں کا نمایاں رول رہا ہے۔ پوپ تومس اکویناس (Thomas Aquinas) کے فلسفہ پر ابن رشد کے آراء کا نمایاں اور واضح اثر ہے۔ یہاں تک کہ ان ابواب پر بھی اس کے اثرات نمایاں ہیں جس کو تومس (Thomas) نے عقل، عقیدہ اور اسرار الٰہی کے ادراک پر عقل کی کمزوری کے متعلق لکھا ہے۔ یہ صرف ابن رشد کی کتاب کا ایک باب "**فصل المقال فيما**

۱- جودہ ہلال ومحمد صبح: قرطبۃ فی التاریخ الاسلامی، ص ۱۰۴-۱۰۵

بین الحکمة و الشریعة من الاتصال" کے مشابہ ہے۔ ابن رشد کے فلسفہ کے متعلق توماس (Thomas) کے تاثرات یہاں تک ہیں کہ توما کی کتاب "خلاصہ" جو بعض اسلامی الاصل مذہب پر محیط ہے، ثابت کرتی ہے کہ مغرب پر ابن رشد کے اثرات صرف ارسطو کی کتابوں کی شرح کی صورت میں ہی ظاہر نہیں ہوئے بلکہ وہ اس سے کہیں زیادہ دور رس اور گہرے ہیں[1]

معاصر جرمن فلسفی کانٹ Kant کو ابن رشد کا سب سے بڑا شاگرد تسلیم کیا جاتا ہے۔ گستاؤلیبان (Gustave Le Bon) ابن رشد کے متعلق رقمطراز ہے کہ "تیرہویں صدی عیسوی کے اوائل سے ہی ابن رشد ہماری یونیورسٹیوں میں فلسفہ پر اتھارٹی مانا جاتا ہے۔ جب کہ لوئیس الیون (Luis XI) نے ۱۴۷۳ء میں امور تعلیم کو منظم کرنے کی کوشش کی اور اس نے اس عربی فلسفی اور ارسطو کے افکار و نظریات کی تعلیم کا حکم دیا۔[2]

فلسفی صوفی محی الدین بن عربی (1240/68H-1164/560H) کے اثرات پادریوں، راہبوں اور مسیحی صوفیوں پر بہت زیادہ ہیں۔ اسپین کے پروفیسر "آسین بلاسیس" (Asin Palacious) کا خیال ہے کہ دانتے (Dante) کے صوفیانہ اختلافات اور عالم غیب کے اوصاف بغیر کسی تصرف کے محی الدین بن عربی سے ماخوذ ہیں۔

یہ بات عام ہے کہ مغرب کے فلسفیوں میں جون اکھارٹ (John Akhart) وہ پہلا فلسفی ہے جس نے ابن عربی کے زمانے میں پرورش پائی اور پیرس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ یہ وہی یونیورسٹی ہے جو علوم و حکمت میں اندلس کی ثقافت پر اعتماد کرتی ہے۔ اکھارٹ

۱۔ سعید عاشورہ: فضل العرب علی الحضارة الاوروبیة، قاہرہ، ۱۹۰۷ء، ص ۳۶

۲۔ گستاؤلیبان (Gustave Le Bon): ص ۵۶۹

(Akhart) بھی وہی کہتا ہے جو ابن عربی کہتا ہے کہ اللہ کا وجود حق ہے۔ اس کے سوا کوئی شئے موجود نہیں ہے۔ حقیقت الہیہ تمام اشیاء میں جلوہ گر ہے۔ بالخصوص انسان کی روح میں جس کا ریاضت، معرفت اور تسبیح کے ذریعہ تعلق پیدا ہوتا ہے۔ مادہ کا صورت سے، اجزاء کا کل سے اور اعضاء کا جسم سے جتنا زیادہ تعلق ہے اس سے کہیں زیادہ تعلق روح کا اللہ سے ہے۔[1]

اسپینی فلسفی رایموندلول (Raimondlloul) نے اپنی کتاب ''اسماء الحسنی'' میں ابن عربی سے اقتباس نقل کیا ہے کیونکہ رایموندلول (Raimondlloul) کو عربی زبان پر مہارت تھی۔ ابن عربی کے بعد یہ ایک صدی زندہ رہا۔ اس نے اللہ کے سو نام مقرر کیے اور اس سے پہلے مسیحی دین اسمائے حسنی کی اتنی تعداد سے واقف نہیں تھا۔

۳- طب:

جب اسلام آیا تو اس نے کہانت کو ختم کر دیا اور طب کے لیے اپنے دروازے کھول دئے۔ سحر اور تعویذ کو باطل قرار دیا چناں چہ کسی طبقے نے دین کے نام پر علاج کرنے کی ذمہ داری نہیں لی۔ بلکہ نبی ﷺ نے اطباء سے مشورہ لینے کی اجازت دے دی گرچہ وہ غیر مسلم ہی ہو۔ جب سعد بن ابی وقاصؓ حجۃ الوداع کے موقع پر بیمار ہوئے تو نبیؐ نے عیادت کی اور ارشاد فرمایا کہ ''میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تمہیں شفا دے یہاں تک کہ ایک قوم تم کو نقصان پہنچاتی ہے اور اور دوسری قوم تمہیں نفع پہنچاتی ہے۔ پھر حارث بن کلدہ سے کہا ''سعد کا علاج کرو جس طرح بھی ممکن ہو۔'' حالانکہ حارث دین اسلام کے ماننے والے نہیں تھے۔ قرآن کریم نے لقمان کا بحیثیت حکیم تذکرہ کیا ہے۔ (ولقد آتینا لقمان الحکمة أن اشکر لله) (سورہ لقمان:۱۲)۔

---

[1] عباس محمود عقاد، أثر العرب فی الحضارة الاوروبیة، قاہرہ ۱۹۶۳ء، ص ۹۹-۹۸

''اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا فرمائی کہ اللہ کے شکر گزار رہو''۔

اسلام نے اس پیشہ کو اللہ کی نعمت قرار دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں پر نوازا ہے اور لوگوں نے اسے اپنا پیشہ بنایا ہے۔

اسلامی عربی طب کا مقصد مکمل طور سے حفظانِ صحت ہے۔ یہی وہ حفاظتی پہلو ہے جسے ہم اب علم صحت کہتے ہیں۔ اہل عرب جسم اور اس کیعضویاتی عمل کے مطالعہ کی بنا پر دفع امراض کے ذرائع تک پہونچے۔ ان عربوں نے امراض کے اسباب کو بتانے کی بھی کوشش کی اور اس کے انتشار سے بچنے کے طریقے بتائے۔ اسلامی طب کا مقصد مریضوں کو صحتیاب کرنا ہے۔ ان کے نزدیک اسی میں مرض سے شفا ہے۔

عہد وسطی میں اسلامی عربی طب کی کئی شاخیں ہو گئیں۔ ہر شاخ میں ڈاکٹروں کی ایک ماہر ٹیم ہوتی تھی۔ ابن قیم (وفات ۷۵۱ھ-۱۳۵۰ء) کا کہنا ہے کہ وہ ڈاکٹر طبائعی اور مرودہ (وہ کحال یعنی آنکھوں کا ڈاکٹر ہوتا) کے نام سے مخصوص ہوتے، مبضعہ سرجن کے نام سے مخصوص ہوتے۔ موسہ خاتن کے نام سے معروف ہوتے اور محاجم اور شرط حجام کے نام سے مشہور ہوتے۔ مجبر خلع، وصل اور رباط کے نام سے مخصوص ہوتے یا کواء مکوات کے نام سے مشہور ہوتے، حاقن قربت کے نام سے مخصوص ہوتے اور اسی طرح بیطری جانوروں کا ڈاکٹر ہوتے۔ غرض عربوں نے دانت، امراض تولید، امراض نساء، بچوں اور آنکھوں کے امراض میں بھی مہارت حاصل کر لی تھی۔ یہاں تک کہ انہیں نفسیاتی اور اعصابی امراض پر بھی کامل عبور تھا۔ اطباء مخلص ہوتے تھے جس کا سہرا بقراط پر ہے بلکہ بقراط کی بعض تعلیم قدیم مصر میں ختم ہو رہی تھی۔ خلیفہ مقتدر نے ۳۱۹ ہجری/ ۹۳۱م میں طب کے پیشے کو واجب کر دیا یہاں تک کہ ایک امتحان منعقد کیا جاتا تھا جس میں کامیابی پر اس پیشہ کو اختیار کرنے کی اجازت دی جاتی

تھی۔ صرف بغداد میں اس طرح کے امتحانات میں ۹۰۰ ڈاکٹروں کو سندیں دی گئیں۔ مشہور اطباء اور ڈسپنسری کے علاوہ اسلام کے نظام حسبہ کے مطابق دیکھ بھال کے لیے بھی ایک شعبہ ہوتا۔

اس وقت یورپ میں کلیسا نے طب کو اس بنیاد پر حرام قرار دے رکھا تھا، کہ مرض اللہ کی جانب سے سزا ہے، اس لیے اس کا علاج اور روک تھام ضروری نہیں ہے۔ ۱۲ ویں صدی کے آغاز تک یورپ میں طب حرام تھا۔

عربوں کے اسلامی طبی انسائیکلوپیڈیا کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا گیا۔ اس ترجمہ کے ذریعہ یورپ کے اطباء طب اسلامی سے واقف ہوئے اور جدید دور کے آغاز تک اس چشمے سے سیراب ہوتے رہے۔ ۱۲ ویں صدی میں سرفہرست ابن سینا کی کتاب القانون تھی۔ ابن سینا نے اس کتاب میں عرب، یونان، سریان اور اقباط کے طبی معلومات کو جمع کیا ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں پھیپھڑے کی جلن، اور عدوی سل کے متعلق نئے ریمارک شامل کیے اور ساتھ ہی ساتھ ۷۶۰ دواؤں کی تشخیص کی ۔ ان کی القانون کا ترجمہ گیرارد کریمونا (Gerard of Cremona) نے لاطینی زبان میں کیا۔ تقریباً یہ کتاب دس بار چھپ چکی ہے۔ اسی طرح رازی (وفات ۳۲۰ ہجری/ ۹۲۶ء) کی کتاب حاوی کا بھی ترجمہ کیا گیا۔ یہ ضخامت، مواد اور موضوع کے اعتبار سے قانون سے زیادہ بڑی تھی۔ رازی کی وفات کے بعد ان کے شاگردوں نے اسے مکمل کیا۔ ۱۴۸۶ء میں اس کتاب کا لاطینی میں ترجمہ کیا گیا۔ فتق، حجامت، بخار، گلے کے اعصاب اور اس کے عضلات کے سلسلے میں کئی آراء کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ رازی کی ایک اور کتاب ''کتاب المنصوری'' ہے جس کا ۱۴۸۱ء میں ترجمہ کیا گیا۔ اسی طرح اس کا ایک رسالہ خسرہ اور کھجلی پر بھی ہے جس میں پہلی بار وقتِ نظر کے ساتھ اس کی شناخت اور دواء بتائی گئی۔

شاید رازی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے تجرباتی طب کی بنیاد رکھی۔ وہ حیوانات پر اپنا تجربہ کرتے تھے۔ بندر کو پارہ پلاتے، حیوانات پر بھی دواؤں کے اثرات کو آزماتے اور روز اس عمل کو نوٹ کرتے۔ اپنے مریض سے اس کی کہانی سنتے، پھر موجود حالات کے بارے میں تفصیل سے پوچھتے۔ پھر اس کے شخصی سوابق اور مورثوں کے بارے میں پوچھتے اور ان تمام باتوں کو ایک خاص رجسٹر میں نوٹ کرتے اور جب ضرورت پڑتی تو اس سے رجوع کرتے۔

علی بن عباس (وفات ۳۸۴ ہجری/۹۹۴ء) کی کتاب "الکتاب الملکی فی الطب" کا یورپ میں چھ صدیوں تک رواج رہا۔[1] اسی طرح خلف بن قاسم زہراوی (وفات: ۴۱۴ ہجری/۱۰۱۳ء) کی کتاب ۳ جلدوں پر مشتمل "التصریف لمن عجز عن التالیف" یورپ کے عوام وخواص کے درمیان متداول رہی۔ اس کتاب کا آخری حصہ آپریشن کے متعلق ہے۔ علم جراحت کی تشریح اور اس کی اہمیت کی طرف بھی اس میں اشارہ کیا گیا ہے اور تفصیل کے ساتھ آپریشن کے متعلق بہت ساری باتیں بیان کی گئی ہیں۔ انھوں نے شق القصبہ الھوائیۃ کا آپریشن کیا۔ مثانہ کے اندر ہی پتھروں کو توڑنے کا طریقہ بتایا اور شریان کو جوڑنے کے طریقے کی طرف نشاندہی کی۔ انھوں نے اپنی کتاب میں آپریشن کے آلات بنانے کے طریقوں کو بھی بتایا ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ گیراد کریمونا (Gerard of Cremona) نے لاطینی زبان میں کیا اور یورپ میں یہ کتاب تقریباً دس مرتبہ چھپ چکی ہے۔ اس کتاب کو "سالرنو" (Salerno) اور مونیلیہ (Monilih) وغیرہ یونیورسٹیوں میں مرجع کی حیثیت حاصل ہے۔

عربوں نے امراض نسواں اور ولادت کو بھی آزمایا ہے۔ ہم یہاں صرف مردہ جنین

۱۔ سیدیو (Sidio)، تاریخ العرب العام، ج ۲، ص ۷۷

کی تولید، مانع حمل دواؤں اوران امور کو جس کو ولادت کے وقت ملحوظ رکھنا چاہیئے، ان کی طرف اورعلی بن عباس کے لکھے ہوئے امثال کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کریں گے۔

حنین بن اسحاق ۸۷۷ء پہلے شخص ہیں جنھوں نے علم رمد پر قلم اٹھایااور علمی اسلوب کی اتباع کرتے ہوئے عربی میں کتاب تصنیف کی اور اسے زیور طبع سے آراستہ کیا۔ان کی کتاب ''العشر المقالات فی العین'' پہلی کتاب ہے جس میں آنکھوں کے متعلق طبی طریقے بتائے گئے ہیں اور اس کے نقشے (تفصیلی چارٹ) بھی فراہم کئے گئے ہیں۔تشریح عین کے بارے میں یہ پہلا رسالہ ہے جیسا کہ قاہرہ کے پبلشر ''ماکس مایرہوف'' (Max Mairhov) نے تحریر کیا ہے۔طب عرب کے مؤرخ ادورڈ براون (Edward Browne) کا کہنا ہے کہ ''یوحنا بن ماسویہ ۸۲۷ء نے اپنی کتاب ''دغل العین'' میں لکھا ہے کہ یہ علم الرمد پر عربی میں پہلی کتاب تھی اور آنکھوں کے طب میں سب سے پرانی کتاب۔یہ مختلف پرانی زبانوں میں بھی ہے۔

دسویں صدی میں عرب اطباء سسلی یونیورسٹی کے مخصوص ہال میں پوسٹ مارٹم کے طریقے سے واقفیت حاصل کرتے تھے۔ابن نفیس دمشقی مصری نے دوران خون کے چھوٹے نظام کی دریافت کی۔انگریز ''ہارفن'' نے اس کو نقل کیا ہے اور اس نے خود اس کی تائید بھی کی ہے۔اٹالوی سرفینوس (Servinos) نے بھی اس کی تائید کی ہے۔اس کی تائید معاصر مؤرخ ''مایرہوف'' (Mairhov) کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ ''حقیقت میں اس چیز نے مجھے حیران وششدر کر دیا۔ابن نفیس نے جو کچھ لکھا ہے اسی کے اساس پر ان دونوں طبیبوں نے باتیں کیں۔گرچہ اس کا لفظی ترجمہ کیا گیا ہے۔اس کی تائید علوم عرب کے موضوع پر دومیالی کی کتاب سے بھی ہوتی ہے۔پیرس کے فیزیولوجی کے پروفیسر لیون بینٹ (Leon Binet) بھی اس کے موئید ہیں۔

عربوں نے ہی سب سے پہلے یہ دریافت کیا کہ عام بیماری اس بدبو کے ذریعہ پھیلتی ہے جو ہوا، مخالطہ (بیماری لاحق ہونا) اور متعدی امراض کے ذریعہ منتقل ہوتی ہے۔ ان کے یہاں یہ دلیل تھی کہ کوئی شخص مریض کے ساتھ رہتا ہے، یا اس کا کپڑا پہنتا ہے تو اس کے جراثیم منتقل ہو جاتے ہیں۔ عربوں ہی نے سب سے پہلے مثانہ کی پتھری کو ریزہ ریزہ کرنے کا طریقہ آزمایا۔ شروع شروع میں یہ لوگ مخدر (نشہ آور چیز) کا استعمال کرتے تھے اور اس کو خواب آور دواء کا نام دیتے تھے، شاید عربوں ہی نے سب سے پہلے نشہ آور اسفنج ایجاد کیا۔ فالج، استرخاء، وغیرہ کے علاج میں گرم دوا کے متبادل سرد دوائیں پیش کیں۔ برخلاف یونانی اسلاف کے عربوں ہی نے سب سے پہلے آپریشن میں ''کاویات'' کا استعمال کیا۔ شل کے مریضوں میں ناخونوں کی ہیئت کی طرف متوجہ ہوئے۔ جریان خون کو روکنے کے لیے ٹھنڈا پانی بہانے کی تجویز پیش کی وغیرہ وغیرہ۔

عربوں نے جنون (پاگل پن) کا علاج طبیعی امراض کے علاج کی طرح کیا۔ انگریزوں نے اس مرض کا نام مرض الٰہی یا مرض شیطانی رکھا ہے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ارواح اور شیاطین کی وجہ سے یہ مرض ہوتا ہے۔ صاحب ''عیون الانباء فی طبقات الاطباء'' میں عرب اطباء کے نام کا ذکر کیا ہے جن کی تعداد ۴۰۰ سے کم ہے۔ یہ تعداد ان اطباء کے علاوہ ہیں جنہیں شہرت اور نام آوری بدقسمتی سے حاصل نہیں ہوئی۔ جرمن فلسفی ''ہومولڈ'' (Homewild) اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ عربوں نے طب میں نئی نئی چیزیں ایجاد کیں۔ علم ادویہ بھی ایجاد کیا۔ بہت ساری طبی نباتات کی پہچان کی۔ ابن سینا، ابن داؤد اور ابن بیطار وغیرہ کی کتابوں میں ان طبی معلومات کا اضافہ کیا ہے۔

اسلامی ممالک کے خلفاء کو اس بات کا بڑا اشتیاق رہتا کہ طبی تعلیمی ادارے،

مریضوں کے علاج کے لیے شفا خانے اور اسپتال قائم کئے جائیں۔ اسلام میں سب سے پہلا شفا خانہ ولید بن عبدالملک (۸۸ ہجری/۷۰۶ء) نے بنوایا۔ اس میں اطباء متعین کیے جاتے اور ان کے لیے وظیفے مقرر ہوتے تھے۔ امراض اور وباء کے پھیلنے کے ساتھ گشتی اور غیر گشتی اسپتالوں سے بھی اسلام نے متعارف کرایا۔ ان اسپتالوں میں اطباء کے ساتھ ساتھ مختلف ادویہ، مختلف کھانے، سیرپ، کپڑے اور ڈسپنسری کا نظم کیا گیا۔ اسپتال کے دو حصے ہوتے تھے۔ ایک مردوں کے لیے اور دوسرا عورتوں کے لیے۔ ہر مرض کے لیے ایک خاص شعبہ ہوتا تھا۔ جس میں اس مرض کے مریض داخل کیے جاتے۔ ہر اسپتال میں ایک ڈسپنسری ہوتی جس میں سیرپ، معجون، اور دواؤں کی مختلف قسمیں ہوتی تھیں۔ اس کی نگرانی ایک صدر کرتا تھا اور اس کے ماتحت کئی معاونین ہوتے تھے۔ مریض اسپتال میں قیام کرتا یا جب مریض ٹھہرنے کا تقاضہ نہ کرتا تو اپنے ساتھ دوا لے کر گھر چلا جاتا تھا۔ اطباء اپنے مریضوں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ خاص طور پر ان حصوں میں جس میں مریض رہتا تھا۔ ان اسپتالوں کے لیے سرکار یا بعض اوقات امراء کی طرف سے اوقات مقرر ہوتے تھے، اس کے لیے فنڈ متعین کیا جاتا اور فیاضی کے ساتھ اس پر خرچ کیا جاتا۔ جب اطباء اپنے کام سے فارغ ہو جاتے تو اس موضوع پر موجود کتابی ذخیروں کا مطالعہ کرتے تاکہ یہ ان کے پیشہ میں ممد و معاون ثابت ہوں۔ جب مریض اسپتال میں داخل ہوتا تو اس کا کپڑا اتار لیا جاتا اور اس کے پتے کے ساتھ اسپتال کے سکریٹری کے پاس محفوظ کر دیا جاتا۔ پھر اسپتال کا کپڑا پہنایا جاتا اور اس کا علاج، کھانا اور دوا مفت فراہم کی جاتی یہاں تک کہ وہ شفایاب ہو جاتا۔ رو بہ صحت مریض جب روٹی اور سالم مرغا ایک دفعہ کھاتا اور اسے ہضم کر جاتا تو اسے تندرست مانا جاتا۔ اس وقت اس کا کپڑا اور پیسہ دے دیا جاتا اور گھر جانے کی رخصت مل جاتی۔ یہی ''بیمارستان'' اسپتال میں بھی ہوتا تھا جس کو احمد بن

طولون نے ۲۵۹ ہجری/۸۷۲ء میں قائم کیا تھا۔

عہد نبوی سے ہی سے مسلم خواتین طب سے وابستہ رہیں۔ بالخصوص میدان جنگ میں رفیدہ انصاریہ، ام عطیہ انصاریہ[1] اور نسیبہ بنت کعب قابل ذکر ہیں جنھوں نے احد کے موقع پر رسول ﷺ ساتھ دیا۔ اسی طرح یہ خواتین جنگ یمامہ میں مسیلمہ کذاب کے خلاف لڑیں اور اس جنگ میں اپنے دونوں بازؤں کو کھودیا۔ یہ خواتین مریضوں کا خیموں میں علاج کرتی تھیں۔ یہ خیمہ جنگجو سپاہی کے آخری حصے میں ہوتا تھا اور فوجیں اس کو اپنے ساتھ منتقل کرتیں رہتیں۔ دواؤں کی منتقلی کا عمل اونٹوں اور خچروں کے ذریعہ ہوتا تھا۔

۴- ڈسپنسری:

بیرونی (وفات: ۱۰۵۰م) کا کہنا ہے کہ صیدلی یا صیدلانی سے مراد وہ پیشہ ور ہیں جو کسی بھی شکل میں دوائیں جمع کرتے اور اس کے مفرد اور مرکب کی بہترین قسم کو چنتے۔ سب سے بہترین ترکیب جسے اہل طب نے دوام بخشا وہ ہے سبز گھاس کو اکھٹا کرنا جس کا استعمال علاج میں کیا جاتا تھا۔ دواء یعنی جڑی بوٹی دواخانہ میں ہوتی تھی۔ اُقرباذین سے مراد مفرد دواء کو تیار کرنا اور اس کے قواعد بنانا ہے، جیسا کہ حاجی خلیفہ نے کہا۔

مغربی محققین نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ عربوں نے ہی سب سے پہلے علم ادویہ ایجاد کیا اور وہی سب سے پہلے طبی دواء تیار کرنے میں مشغول ہوئے۔ مختلف علاقوں میں جڑی بوٹی کی تلاش میں محنت کی اور بہت سی نئی قسمیں ایجاد کیں۔ بعد میں عرب کے اس فن کو یورپ نے اپنالیا۔ بہت سی جڑی بوٹیوں کے عربی نام اب بھی یورپ کی ڈکشنریوں میں محفوظ

۱- ابن الاثیر، اسد الغابۃ، ج ۷، ص ۱۱۰

ہیں۔عرب ہی سب سے پہلے دور حاضر کے مروجہ طریقہ پر ''اقرباذین'' تالیف کی۔

عربوں ہی نے دواخانہ کو ترقی دے کر دواخانہ کے کالج کی بنیاد رکھی۔ڈسپنسری اور حوانیت (اجزاء خانہ) کے بھی کالجز قائم کیے۔سب سے پہلے علم اقرباذین کی بنیاد سابور بن سہل (وفات: ۲۵۵ ہجری) اور امین الدولہ بن تلمیذ وفات ۵۶۰ ہجری نے رکھی اور دوا سازی کی کتاب تیار کی۔اس میدان میں ان کے ید طولی کی دلیل دواؤں کا رجسٹر بنانا ہے۔ان میں سے چند مشہور ناموں کا ہم ذکر کرتے ہیں۔مثلاً رازی کی کتاب ''حاوی''، ابن سینا کی کتاب ''قانون''، انطاکی کی کتاب ''تذکرۃ دواء''، ابن بیطار کی کتاب ''الجامع لمفردات الادویۃ و الأغذیہ'' بیرونی کی کتاب ''کتاب صیدلہ'' اور ''کتاب العقاقیر'' ہے۔

عربوں نے سب سے پہلے دوا سازی کی نگرانی کا طریقہ نکالا۔ہر شہر کے دواخانہ کے لیے ایک نگراں مقرر کیا۔اسی طرح طبی نسخہ کا طریقہ ایجاد کیا۔ڈاکٹر پر واجب ہوتا تھا کہ نسخہ پر دوا کا نام لکھیں۔طب کے معمول کے مطابق دواخانہ چلانے کے لیے لائسنس کا نظام بنایا گیا۔دوا فروش کو دوا بیچنے کی اس وقت تک اجازت نہیں دی جاتی جب تک وہ خلیفۂ وقت کے مقرر کردہ امتحان میں پاس نہ ہو جائے۔دوا فروش کے ایک مخصوص رجسٹر میں اس کا نام درج کر دیا جاتا۔

عربوں ہی نے سب سے پہلے دوا فروش طبیب کے معاملات میں مداخلت سے منع کیا۔انھوں نے ڈاکٹر کو ڈسپنسری کے مالک بننے سے اور دوا دینے سے بھی روکا۔انھوں نے دواء کی نگرانی کے لیے ایک نظام بنایا۔دوا کی قیمت مقرر کی جاتی اور نقصان دہ ''سموم'' کے بیچنے سے ڈسپنسری کو وارننگ دی جاتی۔محتسب دواخانوں کی تفتیش کیا کرتے۔کبھی تو ہفتے میں اور کبھی اچانک۔

عربوں نے دواء کو پگھلانے ملانے اور اس کے مزے کو اچھا بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ مربے، میٹھا سیرپ اور مستحلبات کے لیے فارمولے بنائے۔ عربوں نے ہی سب سے پہلے گلاب، سنترہ، یاسمین، لیموں اور بانسوں کے پانی کو استعمال کیا۔ عرب نے جلدی امراض کے علاج کے لیے مرہم، تیل، معجون اور لدائن کو بہتر بنایا اور سب سے پہلے ٹیبلیٹ پر شکر اور چاندی کا غلاف چڑھایا۔ تاکہ اس کا ذائقہ اچھا ہو جائے۔ نیز اقماع اور تحامیل تیار کیا۔

علم ادویہ میں اس قدر ترقی ہوئی کہ وہ بام عروج کو پہونچ گیا۔ دواء کے سوء استعمال سے عوام کو محفوظ رکھنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس لیے حکومت نے دواسازی کو طب سے الگ ایک مستقل شعبہ بنادیا۔ دواسازی کی ایک کمپنی اور پھر ڈسپنسری عمل میں آگئی۔ ڈسپنسری کے پیشہ نے بتدریج ترقی کی اور عطار (Compounder) سے الگ اپنا ایک وجود مستحکم کرلیا۔ اس طرح طب دوسازی سے تقریباً الگ ہوگیا۔ سب سے پہلے بغداد میں دواخانہ قائم ہوا۔ تاریخ کا سب سے پہلا دواخانہ تھا۔ اس انداز کے دواخانے یورپ میں پانچ سو سال کے بعد قائم ہوئے۔[1]

۵۔ علم کیمیا:

عرب اشیاء کے خواص کی طرف متوجہ ہوئے۔ خسیسہ دھاتوں جیسے سیسہ، لوہا اور قصدیر سے سونا اور چاندی تک کو تبدیل کرنے کی طرف توجہ دی۔ اسی وجہ سے ان کو ان دھاتوں اور دیگر چیزوں کے اسرار و رموز مل گئے۔ یہی رجحان عہد وسطی کے بعض مفکروں کے اندر کارفرما رہا۔ ان کی اکثریت نے اپنی کیمیائی تحقیقات کو مکمل طور سے تجرباتی رخ عطا کردیا۔

۱۔ ریاض رمضان العلمی، الدواء من فجر التاریخ الی الیوم، الکویت، ۱۴۰۸ھ، ص ۳۹-۳۷

مغرب کے محققین آج اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ عربوں ہی نے تجرباتی علم کی بنا پر علم کیمیا کی بنیاد رکھی۔ دوسرے طبیعی علوم کے علاوہ انھوں نے ہی اپنے مطالعات کو ان اسرار و رموز سے آزاد کیا جس سے ان کے اسلاف چمٹے ہوئے تھے۔ خاص طور سے اسکندریہ کے سائنس دانوں نے ایک استقرائی طریقہ ایجاد کیا جس میں حسی ریمارک اور سائنسی تجربہ پر اعتماد کیا جاتا اور تولنے اور ناپنے وغیرہ کے لیے باریک بینی کے ساتھ آلات کا استعمال کیا جاتا۔ انہوں نے صحیح علمی تحقیق کے طریقہ کے لیے ایک جرأت مندانہ قدم اٹھایا تھا۔

عرب مؤلفین نے ان آلات کا شمار کیا ہے جنکو ان سائنس دانوں نے اپنے کیمیائی تحقیق میں استعمال کیا تھا۔ ان میں سے کچھ کا محمد بن احمد خوارزمی (وفات ۳۶۹ ہجری / ۹۷۶ء) نے اپنی کتاب "مفاتیح العلوم" میں ذکر کیا ہے۔ مثلاً "کوذ"، بوطق، ماش اور رراط جس کا استعمال سونا پگھلانے کے لیے کیا جاتا تھا۔ آلات تدبیر میں انبیق، زق (زنبیق کی صفائی کے لیے)، موقد اور وہ جڑی بوٹیاں جن کا استعمال اپنی تحقیق کے دوران کیا تھا۔ وہ نمک اور ان کی مختلف قسمیں، شیشہ، اللازورد، سرمہ، زرنیخ وغیرہ ہیں۔

تجرباتی علم کی بنا پر جابر بن حیان علم کیمیا کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ انگلینڈ کے کلفٹن کالج کے کیمیا کے پروفیسر ہولمیارڈ (Holmyard) جابر بن حیان کی تصنیفات کے متعلق اپنی کتاب میں کہتے ہیں کہ اس نے صحیح علم کی بنیاد پر علم کیمیا کو سب سے پہلے ایجاد کیا بلکہ ناشر "پاول کروس" (Paul Krus) کے مطابق جابر بن حیان تجرباتی علوم کے سب سے بڑے موجد بھی ہیں جنھوں نے تجربہ کی بنیاد پر ایک میزان بنایا جو طبیعت اور مزاج کی معرفت کے لیے سب سے بڑا اور سب سے اچھا وسیلہ تھا۔ جابر کے نزدیک کمیت، اعداد، اوزان، ناپ یا اس کے مشابہ اشیاء پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک مکیفات وہ خوبی ہے جس کا کوئی اندازہ

نہیں کیا جا سکتا۔ اسے اوزان سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح وہ طبیعت کے ظواہر کی طرف لوٹنے اور ہر بشری معرفت کے ڈاٹا Data شمار کرنے اور تولنے کے قوانین میں سے ہے۔ یہی ہے جس کے متعلق کراوس کہتے ہیں کہ علوم طبعی کی کسی مذہب کو قائم کرنے کے لیے عہد وسطی میں سب سے بڑی کوشش تھی۔

ابن خلدون علم کیمیا کو جابر بن حیان[1] کی طرف منسوب کرتا ہے۔ عربی طب کے مورخ لوسیان لوکلیر (Lucian Loklear) جابر کو اپنے عہد اور عہد وسطی کا سب سے بڑا سائنس داں تسلیم کرتے ہیں۔ جابر نے علمی تجربہ اور ملاحظات کی بنیاد پر اپنی کیمیائی تحقیق کا آغاز کیا اور اس نے نوشادر کے نمک، چاندی کا شورہ، زنبیق-لیمانی اور حامض ازوت سے متعارف کرایا۔ اسی نے سب سے پہلے سارے کیمیائی تجربات مثلا تبخیر، تقطیر، ترشیح (کشید)، تکلیس (Caleination) اور ازابہ وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ جابر ہی نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ چاندی کا شورہ، کھانے کے نمک کے ساتھ سفید رنگ میں ہوتا ہے۔ تانبہ ہرے رنگ کے شعلے سے نکلتا ہے۔ یہ دریافت جابر ہی نے کی۔ اس کی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا جو کئی صدی تک کیمیا کے لیے مرجع بنی رہی۔

اطباء میں سب سے بڑا کیمیاداں ابو بکر رازی (وفات ۸۶۶ ہجری/۹۴۴) تھے۔ انھوں نے اپنے تمام کیمیائی تجربات کو رموز اور غموض سے الگ کیا۔ ان کی کتاب ''سرالاسرار'' کا ترجمہ جے روسکا (J.Ruska) نے کیا اور اس کی تشریح بھی کی۔ رازی علمی تجربہ کی طرف

۱- ابن خلدون، مقدمہ، ص ۵۰۴

متوجہ ہوا[1] اور اس سے جو نتائج نکلے اس پر بھروسہ کیا۔ اس نے اپنی کتاب میں ان آلات اور مواد کا ذکر کیا ہے جس سے اس نے مدد لی تھی۔ اسی طرح اپنی کتاب میں اس نے ان طریقوں کو بھی شامل کیا جس سے مطلوبہ خمیر کی تیاری میں مدد لی۔ ایک آلہ بھی ایجاد کیا اور اس کی صفات بھی بیان کی۔

مشہور مؤرخ ول ڈیورانٹ (Wall Durant) کہتا ہے کہ تجرباتی علم کی کی حیثیت سے کیمیا کی دریافت کا پورا کریڈٹ ان مسلمانوں کے نام ہے جنھوں نے سائنسی تحقیق کے طریقے بنائے۔ یہ ایک ایسا میدان تھا جس سے یونان ناواقف اور غافل تھا۔

مشہور مسلم کیمیادانوں میں عزالدین بن اَیدمر بن علی جلدکی (وفات: ۱۳۶۲ء) بھی ہیں۔ ان کے متعلق ڈاکٹر عزہ مریدن اپنے انٹریو میں کہتا ہے کہ ''عرب سائنس دانوں میں علی جلدکی بھی ہیں جن کا میں نے کئی بار بغور مطالعہ کیا تو مجھے یقین ہوگیا کہ یہ وہی ہیں جنھوں نے جوہر کا انکشاف کیا اور Missile بنانے کا طریقہ بتایا۔ یہ وہی ہیں جنھوں نے معدنیات اور کیمیائی عناصر میں موجود جوہر کے راز کو بتایا۔ اسے شمسی مجموعہ سے تشبیہ دی۔ انہوں نے ہی پرڈٹون، نیٹرون اور الکٹرون کا نظریہ پیش کیا۔ جس پر آج کے سائنس داں تحقیق کر رہے ہیں۔[2]

شاید یورپی تاریخ معدنیات میں عرب کے انکشاف سے اتنا متاثر نہیں ہوئی جتنا بارود کے انکشاف سے۔ کیونکہ عربوں ہی نے اسلحہ کے لیے اس کا استعمال عام کیا۔

۱- Partington, J.R. "A Short History of Chemistry", New York, 1960, P. 29.

۲- عزہ مریدن، فضل العرب علی الانسانیۃ فی المیادین العلمیۃ، ۱۹۶۱ء، ص ۱۶-۹

۶۔علم طبیعات:

علم طبیعات میں عرب کے مطالعات بالکل صحیح تجرباتی سائنٹفک طریقہ پر مبنی ہیں۔ اس سلسلے میں سرفہرست نام حسن بن ہیثم (وفات: ۱۰۲۹ء) اور ابوریحان بیرونی (وفات: ۱۰۴۸ء) کا ہے۔ ان میں پہلا شخص علم ریاضیات کا بھی ماہر تھا۔ اس نے روشنی کے انعکاس کو واضح کیا اور اپنے مطالعات میں پوری دقت نظر کے ساتھ آنکھوں کے اوصاف بتائے۔ دیکھنے کی صلاحیت اور جوی انکسار کی تفسیر اور دھندلی رویت کو واضح کیا۔

اپنے سائنٹفک طریقہ سے روشنی کے عکس کا مطالعہ کیا اور ایک نظریہ پیش کیا جو مذکورہ سوال کے جواب میں تھا۔ ہمارے پاس ایک اسطوانی آئینہ ہے اور نقطہ کے مانند دوسری چیز ہے تو ہم کیسے یہ طے کریں کہ یہ وہی چیز ہے جسے آنکھ دیکھ رہی ہے اور یہ وہی چیز ہے جو آئینہ میں نظر آرہی ہے؟ ابن ہیثم کا چوتھے ڈگری کے برابری کی صورت میں جواب اس حل میں خط کی صورت میں تھا ایک دائرہ کاٹتا ہے اور ایک زائد قطاع۔ اس طرح روشنی کے عکس کے سلسلے میں اس کے نظریہ نے دقیق علمی نزعت کو ختم کر دیا۔

اس کی رائے تھی کہ روشنی مرئیات سے پھوٹتی ہے۔ آنکھ سے نہیں، یہ اسلاف کا گمان غلط تھا۔ اس سلسلے میں اس کی سب بڑی کتاب ''المناظر'' ہے جس کا فریڈ ریک ریزنر (Frederick Rsiner) نے لاطینی زبان میں ترجمہ کیا اور سوئز رلینڈ کے بازل شہر سے ۱۵۷۲ء میں ''کنز البصریات'' کے عنوان سے شائع کیا۔ اس کتاب کا اثر وائٹلو (Vitlo)(۱۲۷۰ء) اور روجر بیکن (Roger Bacon) (۱۲۹۲ء)، لیونارڈ دافنشی (Leonard da Vinci) (۱۵۱۲ء)، کلیر (Klear)(۱۶۳۰ء) اور دوسرے معروف یورپی سائنسدانوں پر بہت زیادہ ہوا۔

بیرونی کا شمار علم طبیعیات اور ریاضیات کے مشہور سائنسدانوں میں ہوتا ہے۔ یہ اپنے علم کی روشنی میں ثقل نوعی کے اندازے، زمین کی گردش، سورج گرہن اور دوسرے ظواہر تک پہونچا۔ مغربی محققین نے اس چیز کو آگے بڑھایا۔ مستشرق اڈورڈ سخاو (Eduard Sachau) کہتا ہے کہ "تاریخ عالم کا سب سے زیادہ عقل مند شخص بیرونی تھا۔" بیرونی نے اپنے مخروطی آلہ کے ذریعہ ثقل نوعی کا اندازہ کیا جس کا شمار کثافت ناپنے کے سب سے قدیم آلہ میں ہوتا تھا۔

خازن کا شمار بھی ۱۲ ویں صدی کے نصف اول کے سائنسداں میں ہوتا ہے۔ اس نے موازین کے متعلق لکھا۔ اس کی ایک کتاب "میزان الحکمۃ" کے نام سے ہے۔ جس میں ان اوزان کے متعلق دقت نظر سے بیان کیا گیا جن کا مسلمان اپنے تجربے میں استعمال کرتے تھے۔ ایک میزان ایسا بھی تھا جس سے ہوا اور پانی میں جسموں کا وزن کیا جا سکتا تھا۔ یہ کتاب بہت سارے مختلف اوزان کے ابواب پر مشتمل ہے۔ جیسے: معدنیات اور سیال وغیرہ۔

روشنی کے سلسلے میں خازن کے کچھ نظریات بھی ہیں۔ اس نے ایک ہزار سال سے پانی کے اندر جسم کے انکسار کا مطالعہ کیا۔ لاطینی اور اٹلی زبان میں خازن کی کتابوں کے تراجم ہو چکے ہیں اور یورپ کے سائنس داں اس سے مستفید بھی ہوئے۔ روبرٹ گروسٹسٹ (Robert Grustost) (۱۱۷۵-۱۲۵۳) جس کا شمار گیارہویں صدی کے اوائل کے مغربی یورپ کے علم طبیعیات کے اولین سائنس داں میں ہوتا ہے۔ اس نے خازن کی کتاب کے لاطینی ترجمہ سے استفادہ کیا۔ اسی طرح روجر بیکن (Roger Bacon) نے بھی خازن کی کتاب سے فائدہ اٹھایا۔

زمین کی کشش کے سلسلے میں بیرونی اور ابن سینا کے افکار ونظریات نے نیوٹن کی

مدد کی اور قانون کشش کے راہ ہموار کی نیز جدید سائنسی بنیاد پر وزن کی تعلیل کی ہے[1]

۷۔علم فلکیات:

عرب کو علم فلکیات میں بھی مہارت تھی۔اس فن کے ارتقاء میں عربوں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔حماس، بغداد کے مدارس، دمشق، سمرقند، قاہرہ، فارس، طلیطلہ، قرطبہ وغیرہ[2] میں علم فلکیات کی تعلیم ہوتی تھی۔انہوں نے مختلف مطالعہ گاہیں قائم کیں جو وسط ایشیا سے بحر اٹلانٹک تک مختلف اسلامی ممالک میں پھیلی ہوئی تھیں۔اس میں سب سے اہم مطالعہ گاہ بغداد کا ہے جس نے سات صدیوں (۷۵۰ سے ۱۴۵۰ء تک)[3] میں بہت زیادہ ترقی کر لی تھی۔ان کے ذریعہ بہت سی اہم معلومات اور انکشافات کو دنیا کے سامنے پیش کیا گیا۔

حساب فلکی میں خطوط التماس دس صدی عیسوی سے داخل ہے۔ستارے کی حرکت کے لیے جدول بنائے گئے۔دقت نظر کے ساتھ سورج کی سمت طے کی گئی۔نقص میں اس کے مدارج متعین کیے گئے۔اعتدالین کا صحیح اندازہ کیا گیا۔ایک سال کی مدت پہلی مرتبہ طے کی گئی، چاند کے سب سے بڑے خط عرض کو ثابت کیا گیا۔[4]

زمین کی گردش کے نظریہ تک رسائی ہوئی اور اسطرلاب، مکمل، سطح، ہلالی، مطیع، آلہ رسد (ٹلسکوب) کی ایجاد اور دوسرے معروف آلات تیار کئے گئے جن سے غیر رسمی طور سے

۱۔ عباس محمود عقاد، اثر العرب فی الحضارۃ العربیۃ، ص ۴۰

۲۔ الفونس اتین رینیہ (Alfonso Atin Rinie): محمد رسول اللہ، ص ۳۷۵

۳۔ گستاؤلیبان (Gustave Le Bon): حضارۃ العرب، ص ۴۸۱

۴۔ ایضاً

اوقات جانے جاتے۔ عربوں نے ہی مساجد میں بالکل صحیح طور سے پورے ملک میں قبلہ کا رخ طے کیا اور بہت سی اہم فلکی معلومات دنیا کو دیں۔

انہوں نے فکرِ انسانی میں نئی فلکیاتی معلومات کا اضافہ کیا جو اس سے پہلے معروف نہ تھیں۔ ان عظیم معلومات کے علاوہ انہوں نے ان بہت سی بڑی بڑی غلطیوں کی تصحیح بھی کی۔ جو یونان سے سرزد ہوئی تھیں۔ بعد میں یورپ نے اس سے استفادہ کیا۔ علم فلکیات میں نئی تہذیبوں/ اصلاحات کے بہت سے فائدے ہوئے۔ جس کا آج ہم مشاہدہ کرتے ہیں۔ آج بھی علم فلکیات عربی اصطلاحات سے بھری ہوئی ہے۔

علم فلکیات کے عرب ماہرین میں بنوموسیٰ بن شاکر، ابو معشر البلخی (وفات ۲۷۲ ہجری/ ۸۸۶ء)، ثابت بن قرہ، فرقانی، بوزجانی اور بیرونی وغیرہ کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ ان کی تالیفات کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا اور ہمارے جدید دور کے اواخر تک یورپ کے لیے یہ علم کا مخزن اور مرجع ثابت ہوئیں۔

۸- علم ریاضیات:

عربوں نے مختلف علوم وفنون کی طرح علم ریاضیات میں بھی دسترس حاصل کی۔ اس کا بھی مطالعہ کیا یہاں تک کہ یہ علم ان کے نزدیک معروف اور مشہور ہوگیا۔ انہوں نے اس میں قابل رشک تحقیق کر کے اسے دنیا کے سامنے پیش کیا اور یونان اور ہندوستان سے جو کچھ نقل کیا تھا اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس میں بہت سی معلومات کا اضافہ بھی کیا۔

فلکیات کے سلسلے میں عربوں نے ہندوستانی رسائل کا ترجمہ کیا۔ اس طریقے سے عرب ہندی اعداد سے واقف ہوئے۔ انہوں نے اسے آراستہ کیا اور یورپ کو سونپ دیا جو آج تک ارقام عربیہ Arabic Number کے نام سے پوری دنیا میں رائج ہے۔ محمد بن موسیٰ

خوارزمی نے ان اعداد کو اپنے ریاضی کے جدول میں استعمال کیا ہے۔ خوارزمی نے علم حساب کے موضوع پر اپنی کتاب ''حساب الجبر والمقابلہ'' میں وہ عددی نظام پیش کیا ہے جسے اعشاریہ کا نظام کہا جاتا ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ ۱۲ویں صدی کے نصف اول میں ''ادلار اوف بٹ'' (Adlerov Butt) لاطینی میں ہوا۔ جسے ''الفورتمی'' کے نام سے شائع کیا گیا کیونکہ فورتمی اس کا استاذ تھا اس لیے اس کی جانب نسبت کی ادلاروف (Adlerov) نے بذات خود عربی زبان اندلس کے مدارس میں حاصل کی ہے[1]

۹۷۶ء میں محمد بن احمد خوارزمی نے اپنی کتاب ''مفتاح العلوم'' میں رائے دی کہ اگر شمار کرنے میں دس کی جگہ کوئی عدد نہ ہو تو وہاں حساب رکھنے کے لیے ایک دائرہ کا استعمال کرنا چاہیے تاکہ حساب برابر ہو جائے۔ اس دائرہ کو اس نے صفر کہا۔ صفر ریاضی کی تاریخ میں ایک بہت بڑی پیش رفت تھی جس سے بشری عقل نے رہنمائی حاصل کی۔ یہ عربوں کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ ایک مؤرخ ''ایر'' کا کہنا ہے کہ صفر کا نظریہ سب سے بڑا علمی سرمایہ اور ہدیہ ہے جسے عرب مسلمانوں نے یورپ کے سامنے پیش کیا۔ حقیقت میں صفر کی علامت لکھنے کا قابل تعریف واقعہ حسابی شمار میں ایک مکمل انقلاب تھا۔ عربوں نے صفر کا استعمال ''کچھ نہیں'' کے معنی میں بھی کیا ہے۔

اس طرح عربی اعدادی نظام نے حساب کے کمال ادراک میں عربوں کی مدد کی۔ کیونکہ طاق و جفت اعداد کے حقائق سے وہ واقف تھے۔ انہوں نے جذر، مربع، تکمیل کے استخراج اور ان دونوں کے تعلقات کو بھی متعین کیا۔

علم الجبرا بھی عرب کا مرہون منت ہے۔ عرب نے پہلی بار اس کا نام علم الجبرا رکھا۔

۱۔ جورج یعقوب: أثر الشرق فی الغرب، ص ۲۲-۲۴

جسے آج تک انگریزوں نے عربی نام سے محفوظ رکھا ہے۔ عرب ہی نے سب سے پہلے علمی منہج پر اس صنف میں کتابیں لکھیں۔ خوارزمی کی مذکورہ کتاب میں اس علم کے اصول وضوابط پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح علم مثلثات کی پرانی جدولیں بھی پائی جاتی ہیں۔ خوارزمی ہی نے دودرجی مساوات کے ہندسوں کا فارمولا بھی دیا۔ یورپ کی یونیورسٹیوں نے ۱۶ویں صدی تک اس کی کتاب ''الجبرا والمقابلہ'' کو اپنا مرجع مانا، لفظ الجبرا کو یورپی زبانوں میں متعارف کرایا۔ ڈاکٹر علی مصطفیٰ مشرفہ کہتے ہیں کہ ''خوارزمی صرف علم الجبرا کے ہی موجد نہیں بلکہ مشرق ومغرب میں پھیلی ہوئی سائنس یہ واضح کرتی ہے کہ مشیت الٰہی کے بعد یہ فضل خوارزمی کی کتاب کو حاصل ہے جو عرب وعجم کے مولفوں اور مترجموں کا پہلا مرجع رہا ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا درست ہے کہ خوارزمی علم الجبرا کے موجد بھی ہیں اور تمام لوگوں کے استاد بھی۔

نصیر الدین طوسی (۵۹۷-۶۶۲ ہجری، ۱۲۰۱-۱۲۷۴ء) نے بھی علم ریاضیات میں اضافہ کیا۔ انہوں نے اس عنوان کے تحت ایک کتاب بھی لکھی۔ اس میدان میں علماء عرب جبری مساوات کے حل تک پہونچ گئے۔ اس کے استعمال شدہ رموز سے جدید مغربی ریاضی دانوں نے فائدہ اٹھایا۔

اسی طرح علم التفاصیل والتکامل کی ایجاد میں عربی عالم ثابت بن قرۃ (۲۲۱-۲۸۸ ہجری/ ۸۳۶-۹۰۱ء) کو فضیلت حاصل ہے۔ اس فضیلت میں ابوالوفاء محمد بوزجانی (وفات ۳۸۷ ہجری/ ۹۹۸ء) بھی اس کے ساتھ شریک ہے۔ اس علمکو آج بھی ہمارے زمانے میں علم ریاضی اور علم طبیعیات کی ترقی میں رہنما کی حیثیت حاصل ہے۔

علم المثلث بھی عرب ریاضی دانوں کا مرہون منت ہے۔ علامہ ''ہل'' کہتے ہیں کہ عربوں کے ورثہ میں سے علم مثلث، علم زاویہ والتماس بھی ہے۔ بیورباخ، رجیومانوس اور

کوبرنیق کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ علوم عرب کی اساس سے بے نیاز ہوکر موجودہ مقام تک پہونچ جاتے۔ وہ اس کے بغیر علم ریاضیات کے میدان میں کچھ نہ کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ اہل عرب اپنے نظریات کو عملی نمونوں کے ذریعہ ثابت کرتے تھے۔ یہ چیز علم جغرافیہ (زمین کی پیائش، خاص طور سے پہاڑ کی اونچائی اور وادیوں کی وسعت کی پیائش یا دو نقطے کے درمیان مسافت) کے حساب میں درجہ کمال تک پہونچنے میں مدد ومعاون ثابت ہوئی۔ عربوں نے اس علم کا استعمال پانی کی نالیوں کی تزئین میں بھی کیا۔[1]

۹-علم نباتات:

علم نباتات، طب، دواسازی اور زراعت غرض تمام علوم کی نشوونما عرب کے ہاتھوں ہوئی۔ یہ عرب ان نباتات کا بغور مطالعہ اور مشاہدہ کر کے اپنی تحقیقات میں اس کے نتائج درج کرتے تھے۔ یہاں تک کہ رشید الدین صوری (۵۷۳-۶۳۹ ہجری/ ۱۱۷۷-۱۲۴۱ء) اپنے ساتھ ہمیشہ ایک مصور رکھتے تھے جس کے پاس قسم قسم کے رنگ ہوتے تھے۔ رشیدَ الدین جب جڑی بوٹیوں کی تلاش میں جنگلوں اور کوہستانی علاقوں میں جاتے تو پہلے کسی بوٹی کا مشاہدہ کرتے اور اس کی چھان بین کرتے، پھر اسے اپنے مصور کو دکھلاتے جو پہلے اس کے رنگ، جڑ، شاخوں اور پتوں کی مقدار کو بغور دیکھتا اور تصویر بناتا۔ پھر جڑوں کے رنگ کے مطابق اس میں رنگ بھرتے، پھر ہر بوٹی کو اس کے مختلف زمانوں، وقت ظہور، وقت کمال، وقت طراوت اور خشک ہونے کا وقت دیکھتے۔ اس کے بعد ہر وقت کی تصویر الگ الگ مختلف

---

[1] ا۔ ی۔ ھ۔ ھل (I. H. Hall) الحضارة العربية، ص ۱۰۸

رنگوں میں بنواتے[1]۔اس طرح کا خیال ابن ابی اصبعہ کا بھی تھا۔[2] اس تجربہ کی روشنی میں علماء عرب نے بہت سارے طبیعی مواد کو جانا جن سے ان کے اسلاف ناواقف تھے۔انہوں نے ان مواد کو طبی جڑی بوٹیوں میں داخل کردیا۔شاید یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ''راوند،'' خیار الشنبر'' المن'' والکافور'' کا استعمال کیا۔انھوں نے اسود پیدا کرنے کی کوشش بھی کی اور بعض نباتات کو اس کے طبی اثرات میں جڑی بوٹی کی خصوصیات کا لباس پہنایا۔

نباتات کے مطالعہ کی دنیا میں مشہور عربوں میں ابو جعفر احمد ابن محمد غافقی (وفات ۵۵۰ ہجری/۱۱۶۰ء) بھی ہیں۔انہوں نے اپنی کتاب ''الادویہ المفردۃ'' میں نباتات کے نام عربی، لاطینی اور بربری میں بھی لکھے ہیں۔میکس میرہوف (Max Mairhov) کا خیال ہے کہ براعت اور اصالت میں غافقی سب سے بڑا دواساز ہے۔اس نے پورے عہد وسطی میں نباتات کے میدان میں اعلی مقام حاصل کیا۔علم نباتات میں سب سے زیادہ مشہور ماہر ابن بیطار (وفات ۶۴۶ ہجری/ ۱۲۴۸ء) ہیں۔ان کی اہم کتابوں میں ''الجامع فی الادویہ المفردۃ'' کو اہم مقام حاصل ہے۔اس میں انہوں نے ایک ہزار ۴ سو دواء کی صنف کا تذکرہ کیا ہے۔یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ۴ سو صنف کی جڑی بوٹیوں کے ذریعہ دواسازی کے میدان میں دنیا اس سے پہلے متعارف نہیں تھی۔انہوں نے ان حشائش کا مطالعہ کیا جو کھیت میں پیدا ہوتے ہیں اور کاشت کو نقصان پہونچاتے ہیں۔دیگر مسلمان ماہر نباتات میں: ابوعبداللہ بن بصال طلیطلی، ابن ملک طغنری غرناطی، ابن عوام اشبیلی اور ابن لونکو قرطبی ہیں۔ابن بصال نے بنی ذی النون کے زمانے میں طلیطلہ میں پرورش پائی۔اس کا زمانہ پانچویں صدی ہجری کے درمیان کا تھا۔یہ بنی

۱- الاعلام: ۲۳/۳

۲- طبقات الاطباء: ۲۱۶/۲

ذی النون کے ہرے بھرے، شاداب، اور شاندار باغات کی نگرانی کرتا تھا جو بہت زیادہ مشہور تھا اور اسے طلیطلہ کے باہر لگایا گیا تھا۔ یہ پودہ کاری، زراعتی آفات سے بچنے کے کامیاب علمی تجربہ کی بنیاد پر مشہور ہوا۔ اس کی کتاب ''الفلاحہ'' اس میدان کی عمدہ کتابوں میں سے ہے۔ اس نے اس کتاب میں پانی، زمین اور نباتات کی مختلف قسمیں اور آفات کے علاج سے بحث کی ہے۔

طغری بھی ایک ماہر نباتات تھا۔ اس کا پورا نام ابوعبداللہ محمد بن مالک تھا۔ یہ غرناطہ کا رہنے والا تھا۔ ۱۱ویں صدی کے آخر میں مملکت غرناطہ میں اس کی پرورش ہوئی۔ اس نے زراعت کے موضوع پر ایک کتاب لکھی جس کا نام ''زھر البستان ونزھتہ الاذھان'' ہے جو ابھی تک شائع نہیں ہوسکی۔

ابن لونکو نے پانچویں صدی ہجری کے دوسرے نصف میں قرطبہ میں پرورش پائی، اور زراعتی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ اس کا انتقال ۴۹۸ ہجری میں ہوا۔

ابن عوام اشبیلی، یہ وہی ہیں جن کا نام کتابوں میں ابوزکریا یحیی بن محمد بن احمد بن عوام اشبیلی ہے۔ ۱۲ویں صدی کے اخر میں اشبیلیہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ''الفلاحہ'' نامی ایک کتاب تالیف کی جس میں انہوں نے زراعتی فنون سے بحث کی۔ یہ کتاب مدرید (Madrid) شہر سے ۱۸۰۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کو ایک مستشرق یوسف انطونیو بنکیری (Joseph Antonio Bankiri) نے شائع کیا اور اس کا اسپینی زبان میں ترجمہ بھی شائع کیا۔

مشرقی اور شمالی افریقہ سے عرب اپنے ساتھ بہت ساری زراعت اور پودے اسپین لائے۔ ان پودوں میں سرفہرست روئی، چاول، گنا، زعفران اور کھجور ہیں۔ کھجور کے درخت

آج بھی جنوبی اسپین کے شہروں اور باغات کے رونق بنے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد اسپین میں زیتون بھی پیدا ہونے لگا۔ آج بھی اسپین میں سب سے زیادہ کاشت زیتون کی ہوتی ہے۔

اندلس کے مسلمانوں نے آب پاشی کے نظام، پانی کے حصول کا نظام اور اسے مختلف طریقے سے تقسیم کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ ان کے آثار آج بھی اندلس کی وادیوں میں موجود ہیں۔ پل، ذخیرہ اندوزی اور نالیاں وغیرہ بھی بہت سے علاقوں میں آج بھی موجود ہیں۔ بالخصوص بلنسیہ اور مرسیہ کے علاقے میں آپ ان کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ قدیم اندلسی طریقے پر آب پاشی کا منصوبہ آج بھی ان کے زراعت میں کارفرما ہے۔

زراعتی فنون مسلمانوں اور ۱۰ویں صدی کے مختلف اسلامی مملکت کے ذریعہ جنوبی فرانس، لیچوریا اور جنوبی سوئزرلینڈ میں منتقل ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ کالے گیہوں آج بھی جنوبی فرانس کی سب بڑی کاشت ہے۔ فرانس آنے والے اپنے ساتھ جو کچھ لائے اسے یہاں لگایا۔ یہ لوگ اپنے ساتھ کھجور کے پودے بھی لائے جو آج ''ریلقیر یا'' کے ساحلکی زینت بنے ہوئے ہیں۔

سینوبوس (Sinobos) کہتا ہے کہ مسلمانوں نے زراعت کی تمام قسمیں استعمال کیں اور سسلی اور اسپین میں اپنے ساتھ بہت سارے نباتات لائے یا یورپ میں اسے لگایا اور اس کی نگرانی اتنے بہترین طریقے سے کی کہ گمان ہوتا ہے کہ کاشت اصلاً یہیں کی ہے۔ مثلاً چاول، زعفران، انگور، عطر، پیلا اور ہرا گلاب، یاسمین، روئی اور گنا وغیرہ۔

عرب نے سائنسی بنیاد پر مرغی کی بھی تربیت کی۔ موفق الدین عبداللطیف بغدادی نے سب سے پہلے کھانے اور پولٹری فارم کے متعلق سائنسی اصول بیان کیا۔

۱۰۔ علم حیوان:

عربوں کو جانوروں کی اچھی اور بری نسل سے بھی واقفیت تھی۔ وہ دودھ دینے والے

حیوان اور عربی النسل گھوڑے کا بھی علم رکھتے تھے۔ان کے عربی النسل گھوڑے آج بھی عالمی شہرت کے حامل ہیں۔علم حیوان کے ماہروں میں جاحظ اور دمیری سرفہرست ہیں۔جاحظ نے ''کتاب الحیوان'' تألیف کی جو حیوانیات کے میدان میں سب سے اچھی کتاب مانی جاتی ہے۔جاحظ نے دقت نظر کے ساتھ اپنی کتاب میں جانوروں سے بحث کی ہے۔جاحظ ایک ادیب، عالم، اور انشا پرداز بھی تھا۔اس نے کتاب البخلاء اور البیان والتبین لکھی۔کتاب الحیوان اس کی سب سے اچھی کتاب ہے جس میں اس نے دقت نظر کے ساتھ اپنے تجربوں کو تحریر کیا ہے۔یہ جانوروں کے بعض اعضاء کو کاٹتا، بعض میں زہر ڈالتا اور کچھ جانوروں کو ذبح کرتا تاکہ اس کے پیٹ میں موجود چیزوں کا مطالعہ اور مشاہدہ کر سکے۔پھر اسے ہلکی مٹی سے چھپا دیتا تاکہ اس کی حرکات وسکنات کو جان سکے اور اس کے گوشت کو چکھتا تاکہ اس کا مزہ جان سکے۔پیٹ کو چیرتا تاکہ جانور کے بچے کی تعداد جان سکے۔ہر ایک کو ان کی جگہ پر رکھتا اور اس کے اضداد کو جمع کرتا تاکہ اس پر اپنی رائے قائم کر سکے۔

کمال الدین دمیری (۷۴۲-۸۰۸ہجری/۱۳۴۱-۱۴۰۵ء) اور اس کی کتاب ''حیاۃ الحیوان'' کی شہرت مشرق وسطیٰ اور مغرب میں پھیلی ہوئی ہے۔یہ کتاب حیوان شناسی کے موضوع پر مسلمانوں کی سب سے اہم کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔یہ ایک حیوانی ڈکشنری ہے، اس کتاب کے مصنف نے حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق اس میں تمام معلومات جمع کر دی ہیں۔مجلہ المشرق ۱۰:۶۵۷ پھر ۱۵-۳۹۲ کے مطابق اے ایس جی جیا کور (A.S. G. Jaya Kur) نے اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں کیا۔اس کا پہلا حصہ لندن سے ۱۹۰۶ء میں اور دوسرا حصہ ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا۔ ایس جی جیا کور (A.S.G. JayaKar) بمبئی یونیورسٹی کے ایک پروفیسر تھے۔

۱۱-علم بحار/علم جہاز رانی

عربی ملاح احمد بن ماجد کو "علم البحر" نام رکھنے کی فضیلت حاصل ہے۔ یہ پندرھویں صدی میں جزیرہ نما عرب کے جنوب کا باشندہ تھا[۱]۔ جدید فلکی جہاز رانی کا انحصار زیادہ تر ستاروں کی گردش پر ہوتا ہے۔ اس علم کی اصطلاحات آج بھی اپنے عربی نام سے جانی جاتی ہیں۔ عربوں کا اس کی ترویج وترقی میں کافی حصہ ہے۔ عرب کروی علم مثلث میں بھی سب سے آگے تھے۔ انہوں نے اس کے اصول وضوابط وضع کیے اور انہیں فلکی قیاسات میں جہاز رانی کے مراحل معلوم کرنے میں استعمال کیا۔ خوارزمی کے زمانے سے ہی عرب اور اندلس کے علماء ٹیلی اسکوپ کو ترقی دینے میں منہمک ہوگئے تھے۔ اس کی تدریج پر اعتماد کرتے ہوئے سائنسی آلہ کے ذریعہ ستاروں کی بلندی معلوم کرنے میں اس سے مدد لی۔

ابن ماجد نے سب سے پہلے جدید معنی میں جہاز رانی کے قطب نما کو ترقی دی۔ اس کا نام "حقۃ" (قطب نما) تھا۔ صلیبی جنگوں کے بعد یورپ عربوں کے ذریعہ ہی اس آلہ سے متعارف ہوسکا۔ اس قسم کا اور اس نام کا پہلا قطب ابن ماجد کے تقریباً بیالیس سال بعد اٹلی میں بنایا گیا، بلکہ لفظ "بوصلہ" لفظ عربی "حقۃ" کا حرفی ترجمہ ہے[۲]۔

علم البحر کے اصول کے لیے "کتاب الفوائد" سب سے اچھی مثال ہے۔ یہ جہاز رانی کی ہدایات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے اس علم کی تعریف کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ اس کا شمار ان عقلی علوم میں ہوتا ہے جن کے ذریعہ بغیر کسی انحراف کے کیپٹن اپنے مطلوبہ شہر تک پہونچ سکتا تھا۔ اسی طرح اس کتاب کے ذریعہ خط طول اور خط عرض سے واقف

۱- الاعلام: ۱/۲۰۰

۲- انور عبدالعلیم: الملاحۃ وعلوم البحار عند العرب، الکویت، ص ۱۲

ہوا جا سکتا تھا۔ جس سے قبلہ کی درستگی اور صحیح صحیح شہروں کے صحیح جائے وقوع کو معلوم کیا جا سکتا تھا۔ اس سے ہوا کے چکر کی تقسیم اور اس کے رخ کی معرفت اور موج کے مطابق سفر کے لیے سازگار موسم متعین کیا جاتا اور مختلف بندرگاہوں کی طرف رخ کیا جاتا تھا۔ ابن ماجد نے ان تمام چیزوں کے علاوہ اس میں علم ارصادات کا بھی اضافہ کیا ہے۔ جس سے سواحل اور جزیروں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ جس کے ذریعہ پانی کی خصوصیت، علاقہ کی آب وہوا، مچھلی، چڑیوں اور سمندری کیڑوں کے متعلق بھی آگاہی ہوتی ہے۔

مسلمانوں میں ابن ماجد جیسی بہت سی مثالیں ہیں جنھوں نے جہاز رانی کے علم کو جلا بخشی اور اس کے بہت سے راز سے واقف ہوئے۔ اس فن پر ان کی بہت ساری تصانیف ہیں جو انگریزوں کے لیے صدیوں تک مرجع ومصدر بنی رہیں۔ جن سے انھوں نے استفادہ کیا۔ اس کے محتویات کا اپنی ترقی میں استعمال کیا۔ ہم یہاں مثال میں محمد بن شاذان، سھیل بن ابان، لیث بن کہلان، سلیمان ماھری اور عبدالعزیز بن احمد مغربی کو پیش کر سکتے ہیں۔

۱۲- علم جغرافیہ

علم جغرافیہ کی ترقی وترویج میں بھی عرب کا کافی حصہ ہے۔ اس سلسلے میں ان کی بہت ساری تصانیف اور تحریریں معلومات سے بھری پڑی ہیں جو اس سے قبل معروف نہیں تھیں۔ یہ کتابیں اس فن میں رہنما کی حیثیت رکھتی ہیں۔

گو علم جغرافیہ میں یونان کو عربوں پر سبقت حاصل ہے۔ مگر وہ عرب ہی ہیں جنھوں نے یونان کے علوم ومعارف کی حفاظت کی اور اس کا مطالعہ کیا۔ یہاں تک کہ اس فن میں بھی فوقیت حاصل کرلی۔ عرب نے جو کچھ یونان سے نقل کیا اس میں تصحیح کی۔ اور ان بہت ساری معلومات کا اضافہ کیا جو نہ یونان میں تھیں اور نہ ہی کسی دوسری قوم کے پاس۔ عہد وسطی میں ان کے بعض

کارناموں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ جغرافیہ میں یونانی معلومات کی معرفت کے سلسلے میں یورپ عرب کا رہین منت ہے۔ یورپ ان معلومات سے صرف عربی کتابوں کے ذریعہ ہی واقف ہوا۔

سیر و سیاحت اور سفر سے عربوں کی محبت اور بے پایاں اشتیاق نے انہیں اس علم میں تفوق حاصل کرنے میں مدد کی۔ عربوں نے چین سے لیکر افریقہ تک چکر لگایا اور ان ممالک کے ساتھ وسیع تجارتی تعلقات قائم کیے جن کے نام سے نہ یوروپ کے کان آشنا تھے، نہ انہیں ان ممالک کے وجود کا گمان تھا۔

ان لوگوں میں سرفہرست تاجر سلیمان ہے جس نے خلیج عربی کا سفر کر کے محیط ہندی کو عبور کیا اور چین کے کنارے پہنچا پھر ۸۵۱ء میں اپنا سفرنامہ مرتب کیا۔ اس کی یہ پہلی تالیف چین کے متعلق ہے جو مغربی ممالک میں شائع ہوئی اور اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کیا گیا۔[1]

اس کے بعد مسعودی (۳۴۶ھ) آیا اور مملکت اسلامیہ کا چکر لگانے میں اپنی زندگی کے ۲۵ سال گزار دیے۔ اس نے ہندوستان کی بھی سیر کی اور جو کچھ مشاہدہ کیا اس کو مرتب کیا یہ "مروج الذھب و معادن الجوھر" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کے متعلق ابن خلدون نے کہا ہے کہ مسعودی نے اپنے زمانے کی مشرق و مغرب کے قوموں کے احوال کی شرح کی۔ اور ان کے عادات و اطوار کا ذکر کیا۔ ممالک، پہاڑوں، سمندروں اور شہروں کا بیان کیا۔ اس طرح یہ مؤرخین کا امام بن گیا۔ بہت ساری خبروں کی تحقیق میں اسی کی کتاب اصل مرجع و مصدر کی حیثیت رکھتی ہے۔

اسی طرح ابن بطوطہ (وفات ۷۷۹ھ) نے بھی اسفار کیے اور تقریباً قدیم دنیا کے

---

[1] گستاؤلیبان (Gustave Le Bon): حضارۃ العرب، ص ۴۹۱-۴۹۲

تمام علاقے کی سیر کی۔اس کے سفرنامے کا کئی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔اس کا سفرنامہ پیرس سے ۱۸۵۳اور ۱۸۵۹ء میں شائع ہوا اور ۱۸۲۹ء میں لندن اور ۱۹۱۲ء میں برلن سے شائع ہوا۔

مسلم سیاحوں کے سلسلے میں زکی حسن اپنی کتاب " الرحالة المسلمون فی العصور الوسطی" کے خاتمہ میں لکھتے ہیں:''مسلم سیاحوں کی فضیلت کو واضح کرنے کے لیے اتنا کافی ہے کہ اس میدان میں ان کے مطالعات اتنے زیادہ ہیں کہ وہ تجارت کی تاریخ، سیاسی نظام اور مسلم قوم اور اس سے ملی ہوئی دوسری قوموں کی سماجی تاریخ کا مرجع بن گئے۔کوئی بھی محقق اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔مسلم سیاحوں نے جو کچھ جغرافیہ کے سلسلے میں لکھا ہے وہ بیش بہا خزانہ ہے کیوں کہ ان کے دستاویز تاریخ انسانی کے عظیم الشان دستاویز ہیں۔کوئی بھی محقق ان کی تحقیقات کا مطالعہ کر کے سمجھ سکتا ہے کہ یہی لوگ اس میدان کے سرخیل تھے۔مغربی اور مشرقی ملک کے عہد وسطی کے نصوص کی بحث وتنقیح سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے مطالعات وسیع النظری اور براہ راست مشاہدوں پر مبنی ہیں۔[1]

اسی مصنف نے مغرب پر مسلم سیاحوں کی فوقیت کی دلیل میں ایک مشہور مستشرق ''روِس مانیم'' (Rosmanim) کو پیش کیا ہے۔یہ کہتا ہے:''روسی مستشرق ولادیمیر مینورسکی (Vladimir Minorski) نے لکھا ہے کہ عرب کے جغرافیہ دانوں نے یونانی عالم عہد بطلیموس اور بندقی عالم مارکوپولو (Morcopolo) کے زمانے کے درمیان جو خلیج تھی اسے پر کر دیا اور زمانہ کی دوری بھی ختم کر دی۔عرب سیاحوں کی خبریں اور ان کے قصے بہت زیادہ دلچسپ ہونے کے ساتھ پر مغز اور معلومات سے بھرے ہوئے بھی ہیں۔یونانی علماء کی کتابوں میں یہ چیزیں نہیں ملتیں۔ان کے کارناموں سے ان کی کتابیں بھری ہوئی ہیں اور عظیم بندقی سیاح

---

[1]- زکی حسن: الرحالة المسلمون فی العصور الوسطی، ص ۱۷۹

مارکو پولو (Morcopolo) کی کتابوں میں جو کچھ ہے اس سے کہیں زیادہ تفاصیل عربوں کے یہاں ہیں۔[1]

علم جغرافیہ کی وجہ سے بہت سے عرب علماء مشہور ہوئے۔ ان میں سب سے مشہور الشریف الادریسی ہیں۔ انھوں نے ۱۱۵۴ء میں ایک کتاب بعنوان " نزهة المشتاق في ذكر الامصار و الأقطار و البلدان و الجزر و المدائن و الآفاق" مرتب کی۔ یہ ایک عظیم کتاب ہے جو نہ صرف اس کے مشاہدات بلکہ ماقبل سیاحوں سے ماخوذ معلومات پر بھی مشتمل ہے۔ اس کتاب میں ۴۰ سے زائد جغرافیائی تصویریں ہیں۔ اس میں نیل کے چشموں کی بھی تصویر ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ افریقیائی جغرافیہ کے سلسلے میں عربوں کی معلومات کس حد تک پہنچی ہوئی تھیں۔ اس کتاب کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ عہد وسطی کے علم جغرافیہ سے یورپ بعد میں واقف ہوا اور تقریباً ۳ صدی سے زائد تک اس پر اعتماد کرتا رہا۔

ادریسی نے خالص چاندی سے زمین کا نقشہ بنایا جس کا وزن ۴۰۰ رطل تھا۔ یہ اپنے قسم کا پہلا نقشہ تھا۔ ادریسی نے اس نقشے پہ صوبے، شہروں، نہروں اور سمندروں کو واضح کیا۔ ادریسی نے اپنی کتاب میں خط عرض کے مطابق زمین کو تقسیم کیا۔ یہ پہلا شخص ہے جس نے خط طول کے مطابق زمین کو تقسیم کیا تھا۔

امریکہ کی دریافت کے چند صدی قبل ہی ادریسی نے زمین کے دوسری جانب امریکہ کے وجود کا اشارہ کیا تھا۔ بنسلفانیا یونیورسٹی کے علم حیاتیات کے پروفیسر ڈاکٹر "ھولی لنالی" نے چند دلائل سے ثابت کیا ہے کہ عربوں نے امریکی جزیرہ کرسٹوف کولمبس سے چار صدی قبل ہی تلاش کر لیا تھا، امریکی میگزین نیوز ویک نے اپنے ۱۰ مئی ۱۹۶۱ء کے شمارے میں

---

[1] - ایضاً، ص ۱۸۰

اسے شائع کیا۔

مؤرخ جوٹے (Gute) لکھتا ہے کہ جغرافیہ کے استاذ "الشریف الادریسی" نے یورپ کو اس فن کی تعلیم دی اور ۳ صدی تک اس فن کا استاذ رہا۔

ادریسی کے بنائے ہوئے نقشہ سے پہلے یورپ کے پاس دنیا کی کوئی تصویر نہ تھی۔

معجم البلدان کے مصنف یاقوت حموی (۵۷۴-۶۲۶ھ/۱۱۷۸-۱۲۲۹ء) کا شمار بھی مشہور جغرافیہ دانوں میں ہوتا ہے۔ یہ کتاب ضخیم جغرافیائی انسائکلو پیڈیا ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم ادبی اور تاریخی معارف کا گنجینہ ہے۔ مؤرخ سارٹن (Sarton) کہتا ہے کہ یاقوت کی کتاب معجم البلدان علم ومعرفت کا بیش بہا سرچشمہ ہے اور کسی زبان میں اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ ابوالفداء (امیر حماہ) نے بھی ایک کتاب "تقویم البلدان" مرتب کی۔ ۱۸ ویں صدی میں لاطینی زبان میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔ یہ بہت سے مغربی علماء کا مرجع رہی ہے۔

اس علم میں عربوں کو فضیلت حاصل تھی۔ گستاؤلیبان (Gustave Le Bon) کہتا ہے: "جغرافیہ کے سلسلے میں عربوں نے بہت کچھ دریافت کیا، ان کی اعلیٰ اقدار کو ثابت کرنے کے لیے یہ اشارہ کر دینا کافی ہوگا کہ عربوں ہی نے سب سے پہلے نقشہ پر فلکی معلومات کے لیے جگہوں کو متعین کیا۔ علماء یونان کی بعض غلطیوں کی اصلاح کی۔ عربوں ہی نے سب سے پہلے دنیا کے متعلق دلچسپ سفرنامے شائع کیے۔ یہ اشاعتیں اس وقت ہوئیں جب وہ اپنے وجود کے سلسلے میں خود ہی مشکوک تھے۔ عرب ہی ہیں جنھوں نے جغرافیہ کی کتابیں مرتب کیں جن پر کئی صدیوں تک مغربی قومیں اعتماد کرتی رہیں"[1]

---

[1] گستاؤلیبان (Gustave Le Bon): حضارة العرب، ص ۴۹۹

۱۳۔علم سماجیات

سماجیات (Sociology) گروہوں اور قوموں، جماعتوں اور ان کے رہن سہن، تہوار اور رسم ورواج وغیرہ سے بحث کرتا ہے۔قوم وملت کے عروج، طاقت وقوت کے اسباب و عوامل پھر زوال وانحطاط کے ان عوامل سے بھی بحث کرتا ہے جس سے قومیں نبرد آزما رہتی ہیں۔

سماجیات سے ہم چاہے پہلا معنی لیں یا دوسرا، بہرحال عرب اس فن کے سرخیل ہیں۔ان کے سفرنامے اور پروگرام کی کتابیں اقوام عالم کے احوال نیز ان کے رہن سہن، عادات واطوار اور ان کی انوکھی چیزوں سے بھی پر ہیں۔

اس فن میں سب سے مشہور مسعودی کی کتاب ''مروج الذھب'' ہے جس میں اس نے اپنے زمانے کی اقوام کے حالات سے بحث کی ہے نیز ان کے مسلک، عادات واطوار کا بھی ذکر کیا ہے اور ان کی بہت سی انوکھی چیزوں کو بھی اپنے حیطۂ تحریر میں لایا ہے۔

ابن حوقل اپنی کتاب میں ممالک کی آب وہوا، آبادی، غیر آبادی، ان کے قوانین، اموال، ٹیکس اور تجارت کے متعلق لکھتا ہے۔ تحقیق ما للھند من مقولة مقبولة في العقل أو مرذولة کے مصنف ابوریحان بیرونی ہیں۔بیرونی پانچویں صدی ہجری کے نصف اول کے بعد سب سے بڑی علمی شخصیت تھی۔ جارج سارٹن (Gorge Sarton) نے گیارہویں صدی کے نصف اول کو عصر بیرونی کا نام دیا ہے۔ بیرونی نے اپنی کتاب ۴۲۳ ہجری/ ۱۰۳۱ء میں مکمل کی۔ یہ کتاب علم بشریات میں بھی تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔کیوں کہ بیرونی نے صرف قوم اور ملک کی فطرت کا ہی مطالعہ نہیں کیا تھا بلکہ مختلف ماحول میں رہ کر ان کی زبان وادب کا بھی مطالعہ کیا اور ان کے رسوم ورواج کو جاننے کے لیے اپنے آپ کو وقف کردیا۔ اس مصنف نے اپنی کتاب میں مفردات سے زیادہ مشاہدات اور

مسموعات پر بھروسہ کیا ہے۔

ابن بطوطہ نے اپنے مشہور سفرنامہ " تحفة الانظار فی غرائب الامصار و عجائب الاسفار" میں ان اقوام کے احوال اور عادات بیان کیے ہیں جن کی اس نے سیر کی۔

عبدالرحمٰن ابن خلدون نے اپنے مشہور مقدمہ میں قوم کی ترقی، طاقت و کمزوری، بقا، عروج و زوال کے عوامل سے حد درجہ بحث کی ہے۔ دور جدید میں یورپ کے بہت سارے نظریات پر ابن خلدون کو سبقت حاصل ہے اور یہ سماجیات کا مؤسس مانا جاتا ہے۔

امسٹرڈوم (Amesterdom) یونیورسٹی کے پروفیسر اور "تاریخ الفلسفہ فی الاسلام" کے مصنف ت.ج. دی بوی (T. G. De Bouy) کہتا ہے: "درحقیقت قدیم مؤرخین نے ہمیں ایسی تاریخ کا بحیثیت فن وارث نہیں بنایا جو فلسفہ کی بنیاد پر ہو۔ زمانۂ بعید سے مؤرخین عدم بلوغ انسانیت کی تعلیل (سبب بناتے ہیں) زلزلہ اور طوفان کی طرح آسمانی آفات کی طرف ایک حد تک اسے جوڑتے ہیں۔ اور دوسری جانب مسیحی فلسفہ تاریخ کو واقعات طور پر مانتا ہے جو کہ زمین پر اللہ کی حکومت کی راہ ہموار کرتا ہے۔ ابن خلدون نے پہلی بار حسن ادراک سے انسانی معاشرہ اور اس کے قریبی اسباب کے درمیان ربط پیدا کرنے کی کوشش کی اور بحث و تحقیق کر کے مسائل کے تشفی بخش دلائل پیش کیے۔ احساس اور ھواء کے احوال پر غور و فکر کیا۔ انسان اور معاشرہ کی عقلی اور جسمی تکوین میں اس کے اثرات کو واضح کیا۔

امریکی پروفیسر فورڈ (Ford) نے اپنی کتاب "علم الاجتماع النظری" میں لکھا ہے کہ ان لوگوں کا خیال ہے کہ جس شخص نے معاشرتی زندگی کی حتمی خوشخبری دی وہ مونیسکو (Monosikov) اور وایکو (Vico) ہیں لیکن ابن خلدون نے اسے بہت پہلے بیان

کر دیا تھا۔

آرنولڈ ٹائن بی (Arnold Toyn Bee) نے اپنی کتاب ''دراسۃ فی التاریخ'' میں لکھا ہے: ''ابن خلدون کا شمار عبقری شخصیت میں ہوتا ہے۔ اس نے اپنی کتاب ''مقدمہ'' میں وسیع النظری، تحقیقی گہرائی اور قوت تفکیر کے ساتھ روشن دلائل دیے ہیں۔ پھر لکھتا ہے کہ ابن خلدون نے اپنا مقدمہ جو اس نے عام تاریخ کے لیے لکھا تھا اس میں اپنی عبقری صلاحیت اور ادراک سے تاریخ کے فلسفہ کی بنیاد رکھی۔ بغیر کسی شک وشبہہ کے یہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ زمان ومکان میں اب تک کسی عقل نے اس کی جانشینی کا حق ادا نہیں کیا۔

۱۴- ایجادات:

عربوں نے نابیناؤں کے لئے ظاہری حروف کی کتابت ایجاد کی جو اس سے پہلے دنیا میں کسی نے ایجاد نہیں کیا تھا۔ اندھوں کی پڑھائی کے لئے حروف وضع کرنے والے کا نام علی بن احمد بن یوسف بن الخضر ہے جو زین الدین آمدی سے مشہور ہیں۔ انہوں نے اپنی بینائی بچپن میں ہی کھودی تھی۔ جب بھی وہ کوئی کتاب اپنی لائبریری کے لئے خریدتے تو اس کے ورق کو حرف کی شکل پر موڑ دیتے اور اس کو کتاب میں چپکا دیتے۔ یہ حروف ان کو کتاب کی قیمت معلوم کرنے میں مدد دیتی۔

- اسی طرح عربوں نے اہل یورپ پر جہاز رانی میں بھی سبقت حاصل کی ہے۔ اس کے ایجاد کرنے والے عباس بن فرناس ہیں جو اندلس کے حکیم تھے۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے پتھر کے ذریعہ شیشہ ایجاد کیا، انہوں نے ہی موسیقی کے آلات اور وقت معلوم کرنے کے لئے مثقال ایجاد کی۔ انہوں نے اپنے گھر میں ایک مصنوعی آسمان بنایا جس میں ستاروں، بادلوں اور بجلیوں کی نمائش کے ذریعے ان کے بارے میں ساری جانکاری فراہم کی، دیکھنے

والوں کو اس پر حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ عربوں نے فن طباعت کی جانکاری بھی یورپ سے پہلے حاصل کی چناں چہ ابوبکر القدسی الاندلسی نے طباعت کے خشک روشنائی بنانے کے فن اور چھپائی کے آلات پر ایک کتاب لکھی۔ ناصر کا ایک وزیر عبدالرحمٰن بن بدر صوبائی حکومتوں میں اس حیثیت سے منفرد تھا کہ اس کے گھر میں رجسٹر لکھے جاتے پھر وہ اسے طباعت کے لئے بھیجتا، طباعت کے بعد اسے عمال کے پاس بھیجتا جنہیں وہ جاری کر دیتے۔ یعنی اندلس کے لوگوں نے طباعت کا فن جوتنمبرج (Jotenberg) سے چار سو سال پہلے ہی جان لیا تھا جسے اس فن کا موجد کہا جاتا ہے۔ یہ جرمنی کا رہنے والا تھا۔ مؤرخ جوتیہ (Gute) کہتا ہے کہ عربوں نے جلد سازی کا طریقہ بھی ان سے پہلے سیکھ لیا تھا جب کہ یورپ اس راز سے سولھوں صدی کے نصف اول میں ہی آشنا ہو سکے۔ عربوں نے ہی روئی سے بنے ہوئے اور سستے کاغذات سے یورپ کو متعارف کرایا۔ لوگ اس سے پہلے چمڑے پر لکھتے تھے جو بہت مہنگا پڑتا۔ اسپین میں موجود "شاطبہ" کارخانہ اپنے کاغذات مغربی یورپ کے طرف برآمد کرتا۔ جب کہ مشرقی یورپ مشرق ادنی ہی سے اپنے کاغذ بلا واسطہ خرید لیتا تھا اسی وجہ سے دمشقی کاغذ شارتا داما سینا کے نام سے مشہور ہے۔ ۶۵۰ء میں سمرقند اور فارس میں حریر سے کاغذ بنایا جاتا تھا۔ پھر یوسف بن عمرو نے ۷۰۶ء میں حریر کے بجائے روئی سے کاغذ بنانا شروع کیا۔ یونانی مورخوں نے دمشقی کاغذ کے نام سے اس کا ذکر کیا ہے۔

وزیر فضل بن یحیٰ البرمکی نے بغداد میں کاغذ کی پہلی فیکٹری ۱۷۸ ہجری/۷۹۴ء میں قائم کی۔ اس طرح سے فاطمی عہد کے مصر میں کاغذ کی صنعت کا رواج ہوا۔ یہ صنعت کاغذ بنانے، کتاب لکھنے اور اس کی بائنڈنگ کرنے پر مشتمل تھی۔ اس طرح مصر میں کاغذوں کی دوکان عام ہوگئی۔ مصر کا کاغذ منصوری کے نام سے مشہور ہوا۔ اس طرح کاغذ کی فیکٹری سمرقند

(دمشق)، طبریہ (فلسطین) اور طرابلس (شام) میں وجود میں آئی [1]

عرب فارس، اندلس، سسلیا ور افریقہ میں بیدار ہوئے اور انہوں نے کانوں سے لوہا، پیتل، چاندی اور سونا وغیرہ نکالے۔ خراسان میں عربوں نے معدن سے لوہا نکالا۔ کرمان میں رصاص اور تیل وغیرہ نکالے۔ عربوں نے سب سے پہلے نامہ بر کبوتر کا استعمال کیا۔ یہ کبوتر خفیہ خطوط کو لے جایا کرتا تھا۔ اس کے بعد عیسائیوں نے اس نظام کو اختیار کیا اور اس کو یورپ میں داخل کر دیا۔ ڈاکٹر سجرید ھونکہ (Segrid Honkah) کہتی ہیں کہ عربوں کا اہل یورپ پر بہت احسان ہے حتی کہ انہوں نے ان کو سبزی کے بارے میں بھی جانکاری فراہم کی کہ یہ کھائی جاتی ہیں۔ اہل یورپ نے عربوں سے جھنڈوں کے استعمال کا طریقہ سیکھا۔ عرب اس فن میں زمانہ قدیم ہی سے ماہر تھے [2]

اہل یورپ نے نظافت، غسل کرنا، کپڑے دھونا، عطر کا استعمال اور زیب زینت اختیار کرنا بھی مسلمانوں ہی سے سیکھا۔ ڈاکٹر سجرید ھونکہ (Segrid Honkah) کہتی ہیں کہ سب سے اہم چیز جو یورپ کے لوگوں نے عربوں سے سیکھا وہ ہے غسل کرنا۔ اس سے پہلے یورپ کے لوگ غسل کرنا تک نہیں جانتے تھے۔ جب طرطوشی نے انگریزوں کے ملک کا دورہ کیا تو اس نے دیکھا کہ وہ بہت گندے ہیں۔ وہ پورے سال میں صرف ایک یا دو مرتبہ غسل کرتے ہیں اور کپڑے کا معاملہ تو یہ تھا کہ پہننے کے بعد کبھی نہیں دھوتے تھے۔ جب صلیبی جنگ کا آغاز ہوا تو صلیبی لوگ مشرق آئے تو انہوں نے جگہ جگہ غسل خانے دیکھے اور مسلمانوں کو غسل کرتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی غسل کرنے لگے اس طرح ان کے یہاں غسل کرنے کا رواج عام ہوا۔

۱- الاعلام: ۴/ ۲۵۷

۲- سجرید ھونکہ (Segrid Honkah): فضل العرب علی اوربا، ترجمۃ فؤاد حسنین، ص ۲۹-۳۵

اسی طرح عربوں نے اپنی عورتوں کو زیب وزینت کرنے کی آزادی دے رکھی تھی جب صلیبی لوگ عربوں سے قریب ہوئے اور انہوں نے دیکھا کہ عربوں کی عورتیں زینت اختیار کرتی ہیں تو انہوں نے بھی اپنی بیویوں کو زینت کرنے کے طریقے بتائے یہاں تک کہ یہ چیز ان کے یہاں سب سے عمدہ تصور کی جانے لگی۔

۱۵-فنون اور کاریگری:

مغرب نے فن تعمیر بھی عربوں سے اخذ کیا۔ بالخصوص اسپین میں عرب کی عظیم فن تعمیر کے نقوش آج بھی جلوہ گر ہیں۔[1] شمالی فرانس کے واسٹ شہر میں ایک گیٹ ہے جس کی تزئین کاری قاہرہ کے ''بوابۃ الفتوح'' سے اخذ کی گئی ہے۔ یہی حال وسط فرانس کے دوشہر ''باریہ لہ مونیال'' اور ''شارلیو'' کا ہے۔ یہ دروازہ دیکھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ وہ گمان کرتا ہے کہ کسی مغربی اسلامی شہر کے کسی دروازے کے سامنے کھڑا ہے۔

عہد وسطی میں یورپی فن تعمیر، عربی اسلامی فن تعمیر کی روایت سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ پہلا علاقہ جہاں اس فن کے اثرات سب سے زیادہ مرتب ہوئے وہ شمالی اسپین ہے جہاں اس کے صوبہ لیون رقشتالہ میں چوتھی صدی ہجری کے اوائل سے ہی فن تعمیر کے اثرات ظاہر ہونے شروع ہو گئے۔

محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ فن تعمیر میں قرطبہ کی جدت گنبد بنانے کا وہ طریقہ ہے جو کٹے ہوئے دائرہ اور ظاہری اضلاع پر مبنی تھا۔ وہ طریقہ ہے جس نے تعمیر میں اساسی کردار ادا کیا۔ یورپ میں قوطی تعمیر میں بھی دو صدی تک اسی طریقے کی اتباع کی گئی۔

۱- گستاؤلیبان (Gustave Le Bon): حضارۃ العرب، ص۵۷۲-۵۷۴

عربی زیبائش اور آرائش کے نمونوں میں کوفی خط کو ایک ممتاز اور اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ اس کی خوبصورتی اور فنی برتری نے نہ صرف عرب اور مسلمانوں بلکہ یورپ کو بھی اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ یورپ نے ان سے اپنی نگاہوں کو آسودہ کیا بلکہ اس کی ترقی وترویج اور اسے نقل کرنے میں بھی کافی حد تک اتباع کی۔ انہوں نے مجسمے میں موزونیت اور تکرار میں تناسق پر اپنے فن کو مرکوز کردیا جس کی وجہ سے اس فن میں ترقی ہوئی۔ تزئین کاری کا تصور چوتھی صدی ہجری سے یورپی فن کاروں کو عربی حروف کی طرف متوجہ کرتا رہا اور اس سے مختلف تصورات اخذ کرنیپر ابھارتا رہا۔ کنیسے کے ستون، اس کے دروازے کے دائرے کی کھودائی یا انجیل کے صفحات اور پادریوں کی تختیوں پر تصویریں بنائی جانے لگیں۔

ہمیں اس طرح کی اکثر مثالیں یونان کے اثینا میں بزنطینی اثار کے سنگ مرمر کی تختیوں پر ملتی ہیں نیز یونان کے شہر کالمانا کے خرالبوس کلیسا میں کوفی تزئین کاری کی گئی ہے۔ اٹلی کے شہر کانوسا کے مقبرہ کے دروازے پر کوفی خط کی خوبصورت تزئین کی گئی ہے۔

اسپین میں اویدو (Oviedo) کلیسا کے افریز مذبح میں سنگ تراشوں نے مکمل بسم اللہ نقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ کوفی کتابت فرانس کے کئی کلیساؤں میں دیکھنے کو ملتی ہے مثلاً کاتدرائیہ بوردو، رید کے بطرس بال کا کلیسا اور وسط فرانس کے کاتدلرائیہ میں جو چھٹی صدی ہجری کے دوسرے ربع میں بنائے گئے تھے۔ یہ کاتدرائیہ پر گنبد کے مجموعے ہیں جو عربی اسلامی صنعتِ تعمیر کی نقل ہیں۔

یورپ کے بازار میں مٹی، شیشہ، لکڑی، ہاتھی دانت، معدنیات، پیالے، طشت، چراغدان، شمعدان، دھونی دان کے خوبصورت فنی تحفے عام تھے۔ اسے عام مقبولیت حاصل تھی اور بادشاہ، امراء، مالدار نیز مذہبی افراد بھی اسے شوق سے خریدتے۔ اسی چیز نے یورپی

کاریگروں کی غیرت کو برانگیختہ کیا چناں چہ وہ اسی طرز و اسلوب پر اشیاء بنانے کی کوشش کرنے لگے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یورپ میں مختلف اشیاء سے بنے ہوئے اسلامی تحفے کافی مقدار میں درآمد ہوتے تھے۔ صلیبی جنگوں سے ہی یورپی صنعت وحرفت کے راستے کھل گئے تھے۔ جس کے نتیجہ میں کافی ترقی ہوئی۔ فنی تحفے کی پیداوار یورپی نشاۃ ثانیہ کے زمانے کی ضرورت بن گئی۔ بلنسیہ شہر معدنیاتی برتن بنانے کے لیے مشہور ہو گیا[1] جسے عربی مٹی برتن کی صنعت نے ممتاز کیا تھا۔ اس طرح مالقہ بھی مشہور ہو گیا۔

بلنسیہ شہر کے مٹی کے برتن کی شہرت نے اٹلی اور فرانس کے بڑے بڑے امراء کو شہر میں کارخانے قائم کرنے پر ابھارا، خاص طور سے ان برتنوں کے کارخانے جو ان کے نام اور علامات کے ہوں۔ اسلامی بندرگاہ کی مطلی مٹی کے برتن کے نمونے مشہور تھے۔ وہ برتن جو قصر الحمراء میں پایا گیا اور جس کی بلندی ایک میٹر ۳۵ سینٹی میٹر تھی، وہ اسلامی جدت طرازی کا بالکل نمایاں نمونہ تھا۔[2]

اسپین سے اٹلی نے چمکدار معدنیاتی مٹی کے برتن بنانے کے طریقے اخذ کیے۔ شہر جوبیو (Jubbio) میں کارخانے قائم ہوئے اور وہاں اس صنعت نے بہت زیادہ ترقی پائی۔ اسی طرح اٹلی کے لوگوں نے مٹی کے برتن پر تزئین کاری کے طریقوں میں مسلم صنعت کی تقلید کی، یہ دراصل تزئین کاری کے میدان میں مسلمانوں کے اسالیب کو نقل کرنے کی ابتدا تھی۔ یورپ کی نشأۃ ثانیہ کے زمانے میں اس صنعت کی ترقی میں مسلمانوں نے کافی تعاون کیا۔

۱- A. H. Christie: The Legacy of Islam, P. 126

۲- گستاؤلیبان (Gustave Le Bon)، حضارۃ العرب، ص ۵۱۷

اسلامی طرز کے بنے ہوئے کپڑوں نے عہد وسطی کے یورپ میں دھوم مچادی۔ عرب اسلامی ممالک میں یہ طریقہ بالکل عام تھا جہاں مختلف خوبصورت اور جاذب نظر رنگ کے بنے ہوئے کپڑوں اور سونا یا چاندی کے تاروں سے کشیدہ کاری کے ذریعہ کپڑے بنے جاتے تھے۔

یورپ میں کپڑے بننے کے کارخانے اسی عالی شان ریشم کے کپڑوں کی تقلید کرر ہے تھے۔اس تقلید کے تین مصادر تھے۔ پہلا اسلامی مشرقی ممالک سے عالی شان کپڑے بادشاہوں اور امراء کے لیے درآمد کئے جاتے، دوسرا: ایک لمبی مدت سے اسلامی صنعتی مراکز سے مسلسل مسیحی حکومت کے زیر نگیں کپڑے بننے والے اسپین سے آتے رہے جن کا فن اسلامی روایت کے مطابق تھا۔ خاص طور سے سسلی اور اس کے کپڑے کے کارخانے جسکا اٹلی کے شہروں پر کافی اثر تھا، تیسرا: اسلامی طرز کی بزنطینی کارخانے نے پیروی کی جس کے کپڑوں پر عربی چھاپ تھی جسے یورپ میں بہت زیادہ مقبولیت حاصل تھی۔

اسلامی حکومت کے انقطاع کے بعد بادشاہ روگر ثانی (Roger II) (۵۲۸ ہجری/ ۱۱۳۴ء) کے لیے سسلی میں عربی طرز پر ایک عبا بنایا گیا۔تاکہ وہ اسے اپنی تاج پوشی کی محفل میں پہنے۔ یہ عبا اب بھی ویناّ (Vienna) کے میوزیم میں محفوظ ہے۔اس کی کشیدہ کاری عربی کشیدہ کاری کی نقلہے۔مزید برآں اس پر عربی زبان میں عبارت بھی لکھی ہوئی ہے اور اس پر ہجری تاریخ بھی ہے اس پر اسلامی روایت کے مطابق بادشاہ کے لیے دعا اور مبارکباد کے کلمات بھی درج ہیں۔

یورپ اٹلس نامی ریشم سے واقف ہوا اور جس کا نام "Atlas" عربی سے مأخوذ ہے۔اسی طرح یورپ عربی کپڑے کی ایک اور قسم سے واقف ہوا جو بھیڑ کے بال سے بنایا جاتا

تھا۔اس کا نام ''مخبر'' تھا اور انگریزی میں "Mohair" ہو گیا ہے یہ بھی عربی سے ماخوذ ہے اس کے علاوہ "Gamlet" وغیرہ بھی قابل ذکر ہے[1]

صرف بہترین قسم کے کپڑوں کے معاملے میں ہی یورپ پر عربی اثرات نہیں بلکہ یورپ کی طرز زندگی پر بھی عرب کے اثرات نمایاں ہیں۔علامہ ڈاربر (Darper) کہتے ہیں:

''یورپ کے بہت سے آسائش کے سامان عرب کے ہی مرہون منت ہیں۔عرب نے ہمیں روئی اور تانت کے بنے ہوئے اندرونی کپڑے تبدیل کرنے اور دھونے کے فوائد سکھائیں۔ آج بھی ہماری عورتیں اسی نام سے ان کا استعمال کرتی ہیں۔مثلاً قمیص Gamice اور موزے''[2]

قالین آج کی ناگزیر ضرورت بن چکی ہے جس سے بے نیازی ممکن نہیں ہے۔قالین بھی یورپ میں مشرق کے راستے آیا۔یورپ کے لوگوں نے شروع شروع میں اسے تحفتہً حاصل کیا۔یورپ کے کاریگروں نے مخمل (بال والا) کے ذریعہ قالین کی بنائی کا طریقہ مسلمانوں ہی سے سیکھا۔[3]

عربوں کے ہی توسط سے یورپ معدنیاتی جھلی والے شیشہ کے آئینہ سے واقف ہوا۔اور وہ برونزا (Bronza) اور چمکدار لوہے سے بنے ہوئے آئینے سے بے نیاز ہو سکے۔[4]

1- A New English Dictionary on Historical Principles: Oxford

2- جون ڈارپر (John Darper): تطور اُوربا الفکری: ۲/ ۳۳

3- اَ۔ ھ۔ کریستی A. H. Christie: تراث الاسلام،ص ۱۳۷-۱۳۹

4- ودل دیورانٹ (Wall Durant): قصۃ الحضارۃ ۴/ ۶۱۳

ثقافتِ اسلامی کے تشریعی پہلو

اسلامی قانون ایسا مکمل اور ہمہ گیر قانون ہے جو زندگی کے مادی اور روحانی تمام پہلوؤں کو محیط ہے۔ یہاں کوئی امر بھی قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ چاہے اس کی نوعیت حکم کی ہو یا نص یا ایسے دلائل اور براہین کی جو مجتہدین کی رہنمائی کرتے ہوں۔ اسلامی قانون صرف روحانی معاملات ہی کے لئے مخصوص نہیں بلکہ یہ مادی اور ادبی تمام حقوق کو بھی واضح کرتا ہے۔ نہ یہ کسی ایک قوم کے لیے مخصوص ہے بلکہ یہ تمام انسانوں کے لیے ہے جس میں قوم کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ یہ ایک ہمہ گیر اور ہمیشہ رہنے والا قانون ہے جسے زمانہ منسوخ نہیں کرتا۔ یہ اخلاقی حدود کے اندر عقلی، علمی، مادی اور صنعتی ترقی کے میدان وسیع کرتا ہے۔ اس کے تمام قانونی پہلوؤں اور قواعد میں لچک بھی موجود ہے۔ یہاں فکر ونظر میں تصرف قرآن اور سنت کی روشنی میں ہی ہوتا ہے۔ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ خاص وعام کی مصلحت کے مطابق کام کرے۔

اسلامی قانون کا محقق پہلی ہی نظر میں اس بات کا ادراک کر لیتا ہے کہ وہ احکام جو عبادات کے لیے طے کیے گئے ہیں مفصل ہونے کے ساتھ ساتھ محدود بھی ہیں۔ اس میں وضو، تیمم، حیض، نفاس، روزہ، احرام اور عبادت کی جزئیات سے بحث کی گئی ہے۔ اس میں تفصیل بھی ہے اور آد یت بھی۔ لیکن معاملات، دستور، اقتصاد، شہری، تعزیراتی اور سیاسی احکام میں

آپ تفصیل نہیں پائیں گے۔ قرآن اور سنت نے صرف عام اصول وضوابط کے ایک سادہ خاکے پر اکتفا کیا ہے۔ تفصیل کو چھوڑ دیا ہے تاکہ لوگ اپنی عقل، مصلحت عامہ اور ضرورت کے مطابق احکام کی تطبیق کر سکیں۔

عبادات میں عقل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایسے فرائض ہیں جو زمان اور مکان کے بدلنے سے ختم اور تبدیل نہیں ہوتے۔ اسلام زندگی اور اس کے مسائل میں قانون سازی کی رہنمائی کرتا ہے۔ معاملات کے تصفیے یا انہیں طے کرتے وقت لوگوں کی پریشانیوں میں معاونت کرتا ہے۔ اس لیے نوع بشر کے لیے ضروری ہے کہ اپنی عقل استعمال کر کے قرآن وسنت کے دائم قوانین سے اپنے لیے احکام اخذ کرے جو لچکدار ہو اور انسانی ترقی اور تمدنی رفتار کا ساتھ دے سکے۔

مسلمانوں کی عملی زندگی میں فقہ اسلامی ہمیشہ غالب رہا ہے اور اس کی اشاعت ہوتی رہتی ہی گرچہ نسبتاً عربی زبان کا اتنا رواج نہ ہو سکا۔ مثلاً شافعی مسلک کی شکل میں فقہ اسلامی انڈونیشیا میں عام ہوا نیز ہندوستان، پاکستان اور دوسرے عربی زبان نہ بولنے والے ممالک میں فقہ حنفی کی شکل میں مروج رہا۔

دوسرا معجزہ یہ ہے کہ اسلامی عقیدہ ہمیشہ غالب رہا اگرچہ مسلمانوں کی شکست ہوئی۔ مثال کے طور پر گیارہویں صدی میں سلجوقیوں کا مسلمانوں پر غلبہ ہوا۔ لیکن وہ بعد میں مسلمان ہو گئے۔ اسی طرح تیرہویں صدی میں مغلوں نے مسلمانوں پر فتح حاصل کی مگر پھر انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ معاملات اور عبادات میں فقہ اسلامی، اسلامی تہذیب وتمدن کا بیش بہا خزانہ ہے۔ اس کے اثرات نسل در نسل رہتے ہیں۔ کیونکہ یہ قرآن وحدیث کے ایسے سرچشمہ سے وابستہ ہے جو ہندوستان، چین، روس، ترکی، افریقہ، یورپ اور ایشیا میں اسلامی تہذیب و

تمدن کی بقاء کا ضامن ہے۔خاندانی نظام،ملکیت،عقیدہ کی آزادی اور شریعت کے عام اصول پر اس کے مبادی غالب ہیں۔

اسی فقہ نے عالم عربی کو تیار کیا کہ تہذیب کی بقا کے لیے اس کے پیغام کو عام کرے۔قدیم تہذیب آنے والی تہذیب میں ضم ہوگئی۔اس طرح قدیم اور جدید تہذیب کا سنگم ہوا اور قومیں اس تہذیب کے چشمے سے سیراب ہوئیں۔اس روئے زمین پر یہ تہذیب اختلاط و تطبیق کے عمل سے کسی بھی لمحے غافل نہیں ہوئی۔

تمام عربی علوم میں بھی فقہ کی حیثیت نہ صرف امتیازی رہی ہے بلکہ وہی مرکز نظر بھی رہا ہے، کیونکہ اسلامی تہذیب خود کو علمی و تعلیمی دوام سے سیراب کرتی رہی ہے۔علم و آگہی کے میدان میں فقہ کا ایک بلند مقام بھی ہے کیونکہ اس میں وہ بلند و بالا مثالیں موجود ہیں جو عوام الناس کے لیے مفید ہیں۔فقہ، امت اسلامیہ کو وہ لیاقت عطا کرتی ہے جو اس کی ترقی کی ضامن ہے اور جس کے ذریعہ امت انصاف اور قانون پسندی کی بنیاد پر اپنے آپ کو تشکیل دے سکتی ہے۔فقہ اسلامی کی صلاحیت اور اس کی پختگی و استحکام کی شہادت یورپ کے غیر مسلم مفکرین نے بھی دی ہے۔کئی ایسی بین الاقوامی کانفرنس بھی منعقد ہوئیں جن میں فقہ اسلامی زیر بحث رہی اور اس کے بعض نظریات کا مطالعہ کیا گیا۔۱۹۳۲ء میں ایک عالمی کانفرنس بعنوان ”تقابلی قانون“ ہیگ (Hague) شہر میں منعقد ہوئی۔جس میں فرانس کے ایک بڑے مفکر پروفیسر لمبیر (Lambir) نے فقہ اسلامی کے لیے اپنے عظیم احترام و تقدس کا اعلان کیا۔اس کانفرنس نے مندرجہ ذیل قرارداد اجتماعی طور پر منظور کی۔

(۱) شریعت اسلامیہ کو عام مقننہ ذرائع میں سے ایک سمجھنا۔

(۲) اسلامی شریعت کو زندہ اور تغیر پذیر سمجھنا

(۳) اسلامی شریعت کو مستقل بالذات جاننا۔

اس طرح ۱۹۴۸ میں ہیگ (Hague) شہر میں عالمی ایڈوکیٹ کانفرس منعقد ہوئی جس میں ۵۳ ملکوں کے نمائندے شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کی قراردادوں نے اسلامی شریعت کے کردار کا اعتراف کیا تھا اور تسلیم کیا تھا کہ اس میں لچک اور وزن ہے۔ ان قراردادوں میں عالمی ایڈوکیٹ یونین سے سفارش کی گئی تھی کہ یونین اس تشریعی نظام کا تقابلی مطالعہ کرے اور اس کو رواج دے۔ چنانچہ دنیا کے بڑے بڑے اساتذۂ قانون، جنھوں نے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ حنفی فقیہ حضرت محمد بن حسن (۱۳۲/۱۸۹ہجری) کو اپنا امام ماننے پر مجبور ہوئے۔ انھوں نے انہیں عالمی قانون دانوں کا بابا آدم مانا اور ان کے نام سے ایک اکیڈمی بھی قائم کی۔ جو ان کے مکتوبات اور ان کے متعلق نظریات پر ریسرچ کر رہی ہے۔'' اس اکیڈمی کی کوشش رہی ہے کہ عالمی قانون دانوں کے درمیان انہیں ان کا حق ملے۔ ۱۹۵۱ء میں تقابلی قانون کی عالمی اکیڈمی کے شعبہ قانون نے فقہ اسلامی پر بحث کے لیے پیرس یونی ورسٹی کے کلیۃ الحقوق میں ایک کانفرنس ''فقہ اسلامی ہفتہ'' کے عنوان سے منعقد کیا۔ کئی مستشرق اور مغربی واسلامی ممالک کے اساتذۂ قانون کو دعوت دی گئی۔ ممبران نے پانچ فقہی موضوعات پر لیکچر دیئے، جس کا تعین تقابلی قانون کی عالمی اکیڈمی کے دفتر نے اس طرح کیا ہے۔

(۱) ملکیت کا اثبات

(۲) فوجداری

(۳) عوام الناس کے مفادات کا خیال

(۴) سوشل مسلک کا ایک دوسرے سے متاثر ہونا

(۵) اسلام میں نظریہ سود

لیکچرز کے دوران پیرس ایڈوکیٹ یونین کے ایک ذمہ دار نے کھڑے ہو کر کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ترقی پذیر عصری سماجی ضروریات پوری کرنے والی اساس کی حیثیت سے فقہ اسلامی کے جمود اور اس کی عدم صلاحیت کے بارے میں جو کچھ بتایا گیا ہے اس میں اور دلائل اور براہین کے ذریعہ ان محاضرات اور لیکچرز میں ثابت کی جانے والی اس کی برعکس باتوں کے درمیان میں کیسے تطبیق دوں۔ اس طرح دوسرے فرانسیسی اور مغربی قانون داں اور مستشرق کھڑے ہوئے اور انھوں نے فقہ اسلامی کی تعریف کی اور یہ اعتراف کیا کہ وہ تمام زمان اور مکان کے لیے قابل عمل اور لائق تسلیم ہے۔

کانفرنس کے آخر میں اجمالی طور پر مندرجہ ذیل قرارداد پاس ہوئی۔

فقہ اسلامی ہفتہ کے دوران تقریروں اور مناقشوں کے ذریعہ کانفرنس کے شرکاء کے سامنے جو باتیں آئیں ان سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ فقہ اسلامی کی بنیاد مضبوط اور مستحکم اصولوں پر قائم ہے جس کے نفع بخش ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ اور نظریاتی اختلاف کے باوجود یہ عظیم تشریعی نظام اپنے اندر فقہی آراء کا ایک عظیم سرمایہ رکھتا ہے۔ اپنے انوکھے اور فنی اصولوں کی بنا پر یہ فقہ زندگی کے تمام مطالب کو پورا کرنے کے صلاحیت رکھتی ہے۔ لہذا ارکان کانفرنس نے اپنی خواہش کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ ہر سال فقہ اسلامی ہفتہ منایا جائے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو عالمی قانون سازی کے امام اور اس میدان کے چنیدہ افراد ہیں۔ ان کا یہ دستاویز انسانی زندگی کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے والے اسلام کے تشریعی نظام کا معترف اور قدردان ہے۔ انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ فقہ اسلامی ہفتہ ہر سال ہوا کرے تاکہ انسانیت کے سامنے وہ منفرد سرمایہ جو اس کے دستوری تشریعی اور اقتصادی نظام کا خزانہ ہے، پیش کیا جاسکے۔

تمام عالمی نظام کے مقابلہ میں اسلامی قانون کی برتری ایک علمی حقیقت بن چکی

ہے جس کو دنیا کے بڑے بڑے قانون داں بھی مانتے ہیں۔ ڈاکٹر علی بدوی سابق کلیۃ الحقوق کے ڈین اسلامی اور رومی شریعت کے تقابل کے بعد کہتے ہیں کہ اسلامی قانون یورپی قانون سازی کا پہلا ذریعہ اور منبع ہے۔

رومی قانون کی بنیاد ظاہر پر ہے جو رسمی کاروائیاں اور متعینہ رسوم و رواج کا لحاظ رکھتا ہے ان کے پورے نظام میں اسے محور کی حیثیت حاصل ہے۔ جب کہ شریعت اسلامیہ کی بنیاد معاملات میں سادگی، شکلیات سے علاحدگی اور معاملہ بندی میں فریقین کی نیت اور لوگوں کے درمیان پائی جانی والی فطری انصاف پسند روح پر ہے۔

ڈاکٹر توفیق شحاتہ کہتے ہیں[1] کہ جب ہم قانونی نظاموں کی قدر و قیمت میں موازنہ کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اسلامی قانون سازی عظیم اصولوں کی قدریں متعین کرنے میں رومی قانون سازی سے کہیں آگے ہے جیسے صرف باہمی رضامندی سے ہی ملکیت کی منتقلی، معاملہ بندی میں خیانت کا قانون وغیرہ۔

استاذ شیخ محمد ابو زہرہ کہتے ہیں[2] کہ شریعت نے اپنے احکام کی بنیاد انسانوں اور اجناس کے درمیان برابری اور مساوات پر رکھی ہے، چنانچہ گورے کالے، عربی عجمی وغیرہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔

لیکن جب روم کے قانون کو دیکھتے ہیں تو اس کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ رومن لوگوں کے لیے ہی ہے۔ اور اس کے تمام قانونی حقوق رومن لوگوں کے لیے ہیں، لیکن واجبات سب کے اوپر ہیں۔

1- توفیق شحاتہ: النظریۃ العامۃ للالتزامات فی الشریعۃ، ج ۱، ص ۲۰۱

2- محمد أبو زھرۃ: الفقہ الاسلامی والقانون الرومانی، القاہرہ، ۱۳۸۱ھ، ص ۸-۹

اسلام نے اپنے انسانی احکام میں مرد اور عورت دونوں کو برابر رکھا ہے سوائے کچھ جزئی فرق کے جو اجتماعی نظام کی وجہ سے ضروری ہیں۔ اسلام نے عورت کو ایک مستقل وجود تصور کیا ہے، چناں چہ سماجی مصلحت کے پیش نظر اس کا اپنے مال پر اختیار ہے اور حدود کے اندر خود اسے اپنے اوپر جب کہ رومی قانون عورت کو نہ مکمل شخصیت کا درجہ دیتا ہے، نہ ہی ناقص شخصیت کا۔ یہ پہلے اپنے باپ کے گھر میں ایک باندی ہے پھر اپنے شوہر کے گھر میں۔

اسلام نے مکمل حق ولایت ہر بالغ اور صاحب عقل کو عطا کیا ہے، جب کہ رومن قانون کسی عورت کو کوئی حق دینے کا قائل نہیں ہے جب تک کہ اس کا باپ بقید حیات ہے، وہ خواہ کتنی ہی بڑی باشعور اور طاقتور کیوں نہ ہو جائے۔ چنانچہ کسی ایسے شخص کو حق ولایت حاصل نہیں جس کے والد زندہ ہوں، سوائے اس کے کہ اس کا باپ اسے حق ولایت دے دے۔ دوسری طرف شریعت اسلامیہ میں لڑکے کی ضمانت اور اس کا کیا ہوا عہد اس کے باپ کی ضمانت اور عہد سے الگ ہے۔ وہ تصرف سے قاصر ہے لیکن اس کی ولایت باقی رہے گی۔

ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ فرماتے ہیں[1] کہ یورپی قوانین کے نزدیک فرد ایک اکائی اور زندگیمیں ایک اہم عنصر کیحیثیت رکھتا ہے۔ وہ انسانی مجموعہ کا محض کوئی جز نہیں ہے۔ چنانچہ بے لگام انفرادیت کو پھیلانے کے نتیجہ میں تصرف کا وجود ہوا۔ انفرادی سرکشی کے دباؤ میں اخلاقیات کا محل ڈھیر ہو گیا۔ ان قوانین کی روح کا راز ہے فرانسیسی انقلاب، جس کی بنیاد پر فرانسیسی قانون ترتیب دیا گیا اور وہ ۱۸۰۴ء میں عام ہوا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ فرد کو سیاست اور قانون کے شکنجوں اور پابندیوں سے آزاد کرایا جائے۔ چنانچہ اس انقلاب نے انفرادی حق کو محترم جانا۔ جس کے نتیجہ میں اجتماعی تعاون کی روح پامال ہو گئی۔ یہی روح تمام یورپی

۱۔ محمد یوسف موسیٰ: الفقہ الاسلامی، ص ۸۱

قوانین میں سرایت کرگئی۔ دوسری جانب شریعت اسلامیہ نے انفرادی آزادی بخشی ہے لیکن اس کو اجتماعی مفادات سے جوڑ دیا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں: ''کہ ہر نظام کا ایک ہدف ہوتا ہے لہذا گھڑے ہوئے قانون کا مقصد سماجی سکون واستقرار ہے جس کے لیے یہ قانون وضع کیا گیا ہے، اپنے تمام حقوق و واجبات کے ساتھ جن کا تعلق ایک دوسرے سے ہوتا ہے۔ اس کا متعین ومحدود نفع بخش مقصد ہے۔ مثال کے طور پر قانون قدامت کی بنیاد پر حق کے ساقط ہو جانے کا فیصلہ کرنا جب کہ اس شخص کے لیے فیصلہ کرنا جو کسی پراپرٹی پر ہاتھ رکھ کر یہ کہہ دیتا ہے کہ وہ اس کی پندرہ سال کے لیے ہے اگرچہ اس کی ملکیت کا فیصلہ کر دیتی ہے۔ وہ غاصب اور ظلم ہی ہو اور اخلاق کے تمام قواعد کو پامال کر رہا ہو۔ اسی وجہ سے قانون دینی واخلاقی قواعد سے دور رہتا ہے۔

جہاں تک تشریع اسلامی کا تعلق ہے وہ دوسری چیز ہے۔ وہ فرد ومعاشرہ اور عام انسانیت کا خیال کرتا ہے۔ چنانچہ مفاد عامہ ذاتی مفاد پر مقدم ہے۔ فساد کا خاتمہ مفاد کے حصول پر مقدم ہے۔ جیسا کہ امام شاطبیؒ کہتے ہیں:

تشریع اسلامی ایک منسجم اور ہم آہنگ اکائی ہے۔ ایک باشعور روح کی حامل ہے، اسلام جوا کو حرام قرار دیتا ہے چنانچہ اس روح کو پورے طور پر حاوی دیکھا جا سکتا ہے۔ اسلام میں دھوکے کی بیع حرام ہے جیسا کہ ہوا میں چڑیا کی بیع، شکار سے پہلے پانی میں مچھلی اور کھیت میں موجود سبزی اور غلہ، یا گم جانور کی بیع۔ ان تمام چیزوں سے اسلام نے منع کیا ہے اس لئے کہ اس میں خرید اور فروخت کرنے والے دونوں کے لیے دوکھا ہے۔ یہ ایک لحاظ سے جوا بھی ہے۔

ڈاکٹر عبدالفتاح عبدالباقی فرماتے ہیں[1]: قانون نے جرائم کی سزا رکھی ہے، مگر سزا

---

[1] عبدالفتاح عبدالباقی: نظریۃ القانون، ص۱۶-۱۷

ہمیشہ دنیوی ہوتی ہے، اس لیے کہ قانون بنانے والا آخرت کے کسی امر کا مالک نہیں ہے اس وجہ سے اس شخص پر کوئی جرم نہیں ہے جو دنیا کی سزا سے بچ جاتا ہے۔

ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں[1] جہاں تک آسمانی قانون کا تعلق ہے، جس کی سب سے بلند وارفع شکل فقہ اسلامی ہے، دنیوی سزا سے یکسر مختلف ہے۔ اسلامی قانون اس دنیا میں بھی سزا و ثواب دلاتا ہے اور آخرت میں بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اخروی سزا ہمیشہ دنیاوی سزا سے بڑی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ایک مومن اپنے اندر اسلامی احکام کی اتباع کا ایک قوی داعیہ پاتا ہے، گرچہ وہ دنیاوی سزا سے بچ جانے کی سکت رکھتا ہو۔ دنیا میں اس طرح کی دوسری کوئی وجہ نہیں ہے جو قرآن کریم اور حدیث نبوی کے قوانین کی پیروی پر اکساتے ہوں۔ اس لئے وہی قانون سازی معتبر ہے جسے دین مستند قرار دے وہ فرد اور سماج دونوں کی بھلائی چاہتا ہے۔ قانون کے میدان میں یہ ایسا نفع بخش مقصد ہے جو مستحکم اور مثالی سماجی تعمیر کرتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اپنے دامن میں کسی ایسی چیز کو جگہ نہیں دیتا جو دین واخلاق کے منافی ہو۔ وہ صرف ایک مستحکم اور مضبوط سماجی تعمیر چاہتا ہے بلکہ وہ فرد، معاشرہ اور تمام انسانیت کو نہ صرف دنیا میں بلکہ آخرت میں بھی سرخرو کرنا چاہتا ہے۔ اسلامی قانون کا مقصد ہے کہ انسان کی ایسی تربیت کی جائے کہ وہ اپنے تئیں اور دوسرے بنی نوع انساں کے تئیں اپنے واجبات پوری امانت داری سے ادا کریں اور خدا کی عبادت کے ذریعے اس کے حقوق بھی ادا کریں۔ اپنی گہرائی اور وسعت فکر میں مشہور فقہاء اسلام نے دوسرے ممالک کے ساتھ اسلامی حکومتوں کے تعلقات کی تنظیم کاری کا مطالعہ کیا۔ چنانچہ ابو یوسف کی کتاب الخراج اور طبری کی کتاب الجہاد نے ان مسائل کو چھیڑا جو عالمی قانون کی سطح پر آئے۔ اسلام میں جنگ کے دوران بین الاقوامی تعلقات کے جو قوانین ہیں، اس کی شرح وتوضیح میں محمد بن حسن شیبانی

---

[1] محمد یوسف: الفقہ الاسلامی، ص ۶۹

کی کتاب السیر الکبیر کا ایک نمایاں مقام ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں جنگ کے تمام اصول واحکام ہیں۔اس کتاب کو لکھ کر امام محمد بن حسن شیبانی نے عالمی قانون کے میدان میں بڑے بڑے مغربی قانون دانوں پر سبقت حاصل کر لی ہے۔ جیسے گورٹیس Gortius اور وٹوریا Vittoria اور سرے Saury۔

اسلام کے بین الاقوامی قوانین کی بنیاد قرآن اور احادیث نبوی ہیں۔لیکن ہمیں یہاں ان معاہدوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جو خلفاء نے دوسرے ممالک سے کئے تھے نہ ان احکام کو جنہیں انہوں نے فوج کے کمانڈروں کو بھیجا تھا۔اسی طرح فقہاء کے اجماع کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔جب ہم ان تعبیرات کا استعمال کرتے ہیں جن کو موجودہ عالمی قانون جانتا اور پہچانتا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام میں عالمی قانون کے مندرجہ ذیل مراجع ہیں:

(۱) سلطہ: یعنی وہ عقائد جو قران وحدیث میں وارد ہوئے ہیں

(۲) معاہدے اور دستاویز: یعنی جو معاہدے اور دستاویز اسلامی ملکوں اور دوسرے ملکوں کے درمیان ہوئے

(۳) فقہ: یعنی فتاوی، تبصرے اور قیاس واجتھاد کے ذریعہ اخذ کی ہوئی آراء

(۴) عرف عام: حالانکہ اسلام میں اس کو ثانوی حیثیت حاصل ہے تاہم اس کی اہمیت ومنزلت مسلم ہے اور عالمی قانون میں بڑا ذریعہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

دعوت اسلامی کا مزاج بین الاقوامی قانون کو ایک خاص رنگ دینا ہے، اس طور سے کہ اس کا مفہوم بین الاقوامی قانون کے مروجہ مفہوم سے کسی حد تک مختلف ہوتا ہے، چناں چہ ماہرین قانون کے مطابق بین الاقوامی قانون جنگ وامن کے معاملات میں، کسی معاہدے یا عرف کے تحت، مساوات کی بنیاد پر، آزاد اور خود مختار ممالک کے درمیان تعلقات استوار کرنے

کا نام ہے۔ اس قانون کا اطلاق علاقائی بنیاد پر ہوتا ہے چناں چہ کسی حکمراں کی حکمرانی صرف اس کی زمین اور اس میں موجود چیزوں تک محدود رہتی ہے۔ وہ اس سے تجاوز نہیں کرسکتا۔

یہ مفہوم اسلامی شریعت میں حصہ نہیں ہے۔ کیوں کہ دعوت اسلامی، عالمی دعوت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں علاقائیت سے کہیں زیادہ انسان کے ذاتی وجود کا اعتبار ہوتا ہے۔ چناں چہ یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ علاقائی سرحدیں خود مسلم ملکوں کے درمیان فرق کا باعث بنیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اپنے پیروکاروں کے لئے دعوت اسلامی کے فریضہ کے ادائیگی کو واجب سمجھتا ہے تاکہ روئے زمین کے ہر گوشے میں اس کی ترویج واشاعت کا مقصد حاصل ہو سکے، سلامتی عام ہو اور اللہ کا کلمہ بلند ہو۔

اسلام نہ صرف تبادلے کا اصول اپناتا ہے بلکہ اسے حتمی طور پر نافذ بھی کرتا ہے۔ موجودہ ممالک کے لئے اسلام اس کی سب سے بہتر مثال پیش کرتا ہے۔ اللہ تعالی فرماتا ہے:

''الشهر الحرام بالشهر الحرام، و الحرمات قصاص فمن اعتدى عليكم فاعتدو عليه بمثل ما اعتدى عليكم و اتقوا الله و اعلموا ان الله مع المتقين'' (سورۃ البقرۃ:۱۹۴)

''شہر حرام، شہر حرام کا بدلہ ہے اور اسی طرح دوسری محترم چیزوں کا بھی قصاص ہے، تو جو تم پر زیادتی کریں تم بھی ان کی زیادتی کے جواب میں اسی کے برابر ان کو جواب دو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یہ یقین رکھو کہ اللہ حدود الٰہی کا احترام کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔

استاذ شیخ محمد عبدہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے کہتے کہ ہیں[1] اللہ تعالی نے اس

۱- تفسیر المنار: ج۲، ص۲۱۲

آیت میں ایک عظیم قاعدہ بیان کیا ہے۔یعنی الحرمات (جن کا احترام اور حفاظت ضروری ہے) کے درمیان لازم ہے کہ ان میں مساوات اور قصاص جاری کیا جائے۔امام شافعی نے اس آیت سے یہ استدلال کیا ہے کہ قاتل اسی طرح قتل کیا جائے جس طرح اس نے مقتول کو قتل کیا ہے۔ اگر ذبح کیا ہے تو ذبح کیا جائے، گلا گھونٹ کر مارا ہے تو گلا گھونٹ کر مارا جائے اور اگر غرق کیا گیا ہے تو غرق کیا جائے۔مقصد یہ ہے کہ بدلہ برابر کا ہو تا کہ کسی پر ظلم وزیادتی نہ ہو سکے۔

مزید یہ کے اس سلسلہ میں سب سے بہتر پہلو یہ ہے کہ دشمنوں کے قتل میں یکسانیت ہونی چاہئے اسی طرح جیسے مجرمین کو بغیر کسی کمی یا زیادتی کے سزا دی جاتی ہے، چناں چہ اگر قاتل توپ اور بندوق یا زہریلی گیس کے ذریعہ قتل کرتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ اسی سے قتل کیا جائے۔ یہ آداب وشرائط اسلام کے علاوہ کسی دوسرے قانون میں نہیں پائے جاتے۔اس کے باوجود اللہ تعالی نے قصاص اور برابری کی شرح کے بعد فرمایا کہ: ''اتقو اللہ'' ''اللہ سے بچو'' یعنی کسی کے خلاف حد سے نہ بڑھو، قصاص لینے کے میں ظلم نہ کرو کہ تکلیف میں زیادتی ہو جائے۔

اسلام، جیسا کہ اس کے نام سے ہی ظاہر ہے، امن وسلامتی کا دین ہے۔اس کی بنیاد محبت اور رواداری پر ہے، اسلام جنگ کی اجازت صرف محدود اور مخصوص حالات میں ہی دیتا ہے جب تک کہ جرم ثابت نہ ہو جائے۔صدیوں سے مغربی ممالک میں رائج اس طریقہ پر اسلام کو سبقت حاصل ہے۔

پروفیسر ایس،اے،حق ''عالمی سلامتی میں اسلام کا حصہ'' نامی ایک کتابچے میں لکھتے ہیں کہ ''قومیں اسلحہ پر پابندی اور جنگ روکنے کے لیے یا اعلان جنگ کے خدشات کو کم کرنے کے لئے بہت کوششیں کرتی ہیں، کانفرنسیز منعقد کرتی ہیں، لیکن ان کی کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں۔اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ممالک اپنے آپ کو عہد وپیمان کا پابند نہیں بناتے۔الا یہ کہ ان

کے پاس معاہدہ توڑ دینے کے وسائل ختم ہو جائیں۔ یہاں تک کہ جب ان کے پاس طاقت زیادہ ہو جاتی ہے تو وہ اس بات کا اعلان کر دیتے ہیں کہ جن معاہدوں پر انہوں نے دستخط کئے تھے اور جن دفعات کے وہ پابند تھے، اب اس کی حیثیت صفحہ پر پھیلی سیاہی سے زیادہ نہیں۔ تاریخ میں اس کی بہتیری مثالیں ملتی ہیں۔

جنگ اور جہاد کے متعلق اسلامی احکام کا مکمل طور سے نفاذ کیا جائے تو یہ دنیا بہشت بن جائے ،جس کی اسے تلاش ہے۔ حالاں کہ صورت حال یہ ہے کہ دنیا جہنم میں گرتی جا رہی ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو اللہ کے اس حکم کی اطاعت کرنی چاہیے جس میں وہ فرماتا ہے: ”كلوا و اشربوا من رزق الله و لا تعثوا فی الارض مفسدین“ (سورۃ البقرۃ:٦٠)۔

”کھاؤ اور پیو اللہ کے رزق میں سے اور نہ بڑھو زمین میں فساد مچانے والے بن کر“

اسلام دعوت کے ذریعہ پھیلا ہے، قوت و طاقت کے ذریعہ نہیں۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے: ” لا اكراه فی الدين ، قد تبين الرشد من الغی“ (سورۃ البقرۃ:٢٥٦)

”دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی سے بالکل الگ ہو چکی ہے“۔

امام فخر الدین رازی اپنی کتاب مفاتیح الغیب میں اس آیت کریمہ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں ”اللہ نے جب انتہائی بین اور قاطع دلیل کے ساتھ توحید کی مکمل وضاحت کر دی ہے تو اس کے بعد کافروں کے لئے اپنے دین پر باقی رہنے کا کوئی جواز نہیں رہا مگر اس کو ایمان لانے کے لئے مجبور کرنا اور اس پر زور ڈالنا تو دنیاوی زندگی میں جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ ابتلاء و آزمائش کی جگہ ہے اور دین کے سلسلے میں جبر و اکراہ سے آزمائش اور امتحان کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اللہ فرماتا ہے: ولو شاء ربك لآمن من فی الارض

كلهم جميعا، افانت تكره الناس حتى يكونوا مومنين"(سورہ یونس:۹۹)۔

"اور اگر تیرا رب چاہتا تو روئے زمین پر جتنے لوگ بھی ہیں سب ایمان قبول کر لیتے۔ تو کیا تم لوگوں کو مجبور کرو گے کہ وہ مومن بن جائیں"؟

اسلام کے نزدیک محض کسی کا کافر ہونا اس سے جنگ کرنے کا کوئی مضبوط جواز نہیں ہے۔ اسی طرح پادریوں، عورتوں اور دیگر افراد جن کا جنگ میں کوئی ہاتھ نہ ہو ان سے جنگ جائز نہیں۔ صحیح مسلم شریف میں حضرت بریدہؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ فرمایا کرتے کہ اللہ کے راستہ میں لڑو اور جو اللہ کا انکار کرے ان سے جنگ کرو اور حملہ کرو لیکن اس سلسلہ میں حد سے تجاوز نہ کرو، دھوکہ نہ دو، نہ مثلہ کرو، نہ بچوں کو مارو اور نہ راہبوں کو۔

اگر یہ جنگ دعوت اسلامی کو قبول کرانے کے لئے ہوتی یا اس کی اشاعت کا یہی ایک راستہ ہوتا تاکہ دین کا کوئی مخالف باقی نہ رہے تو ان لوگوں کو جنگ سے مستثنیٰ نہیں کیا جاتا۔ ان کا استثناء اس بات کی دلیل ہے کہ محض کفر قتال کا سبب نہیں ہے۔

ان اصولوں کی بنیاد پر اسلامی ممالک کا ایک دوسرے کے ساتھ تعلق محض رواداری، محبت اور امن وسلامتی پر مبنی ہے۔ یہی اصول بین الاقوامی تعلقات میں بھی معتبر ہے۔ فقہ اسلامی نے دار الحرب اور دار الاسلام کے درمیان تجارت کے نظم ونسق اور اس کے مبادلہ پر بحث کی ہے۔ چناں چہ اسلام تجارت کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور مسلمانوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس کے لیے پورے روئے زمین پر پھیل جائیں۔

اسلام نے غیر مسلموں کو دار الاسلام میں بغرض تجارت داخل ہونے کی حوصلہ بخش اجازت دی ہے۔ غیر مسلم کے لئے حفظ وامان کی یہ اجازت چار ماہ کے لئے ہے لیکن اگر اس کی

تجارت ختم نہ ہوئی ہو تو اس مدت کی تجدید ہو سکتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح اسے ایک سال کے لئے بھی اجازت مل سکتی ہے مگر اس کے لئے اسے ذمی کی طرح جزیہ ادا کرنا ضروری ہوگا۔ امام سرخسی مبسوط میں لکھتے ہیں کہ جنگ شروع ہو جانے کے بعد ان کا مال امان کے حکم کی بنیاد پر محفوظ و مامون سمجھا جائیگا۔ اس صورت میں جائز سمجھ کر ان کا لے لینا درست نہیں۔

بلکہ اسلام میں، جن سے حفظ و امان کا معاہدہ ہو چکا ہے، ان تاجرین کے مال کی نہگداشت کا یہ عالم ہے کہ ان کی ملکیت بحال رہے گی گرچہ وہ دارالحرب لوٹ کر مسلمانوں کے خلاف ہتھیار اٹھالیں۔ المغنی میں ابن قدامہ لکھتے ہیں: ''جب دار الحرب کا کوئی شخص دارالاسلام میں امان کے ساتھ داخل ہو جائے اور اپنا مال کسی مسلمان یا کسی ذمی کے حوالے کر دے یا ان دونوں کو بطور قرض دے دے پھر وہ دارالحرب واپس چلا جائے تو ہمارا خیال ہے کہ اگر وہ تاجر، پیغام رساں یا سیاح یا کسی ضرورت کے تحت وہاں گیا پھر دارالاسلام لوٹ آیا تو اس کی جان اور مال دونوں محفوظ ہوں گے کیوں کہ وہ دارالاسلام سے قیام کی غرض سے نہیں نکلا تھا چناں چہ اس چیز نے اسے ذمی کے مانند بنا دیا لیکن اگر وہ قیام کی غرض سے نکلا تو اس کی جان کا امان ختم ہو جائے گا البتہ مال کا امان باقی رہے گا کیوں کہ دارالاسلام میں اس کا امان کے ساتھ داخل ہونے کا مطلب ہے کہ اس کے مال کو امان دی گئی اسی وجہ سے یہ امان اس کی جان کے بجائے اس کے مال کے حق میں باقی رہے گا۔ امان کا ختم ہونا صرف اس کی جان کے ساتھ خاص ہوگا''۔

دارالاسلام اور دارالحرب کے درمیان خدمات کے تبادلے پر فقہاء نے ایک اہم پابندی عائد کی ہے چناں چہ جنگی ساز و سامان کا دارالحرب بھیجنا جائز نہیں ہے۔ گرچہ فقہاء کے درمیان اس کے دائرے کی حد بندیوں میں اختلاف ہے۔ چناں چہ جب اجنبی تاجران ممنوعہ

ساز وسامان کے ساتھ نکلے تو اس کا بیع باطل نہیں ہوگا البتہ ممنوعہ اشیاء میں سے جو کچھ بھی اس نے خریدا ہے، دارالاسلام چھوڑنے سے پہلے اس کی واپسی لازم ہے۔ امام ابو یوسفؒ کا مشورہ یہ ہے کہ دارالاسلام کے حدود میں حکمراں ان اسلحوں کو وضع کرلے اور اجنبی تاجروں کی تفتیش کی جائے اور ممنوعہ ساز وسامان کی اسمگلنگ پر پابندی لگائی جائے، جس طرح دارالاسلام میں کسی اجنبی تاجر کے لئے شریعت اسلامیہ کی حرام کردہ اشیاء جیسے شراب اور خنزیر کا لین دین جائز نہیں ہے اسی طرح وہ بھی جائز نہیں ہے۔

حنفیہ نے مسلم کو دارالحرب میں تجارت کے لیے داخل ہونے کی اجازت دی ہے۔ لیکن مالکیہ نے اس کی مخالفت کی ہے، اس خوف سے کہ مسلم مشرک نہ ہو جائے۔ ابن حزم فرماتے ہیں کہ امام، جہاد یا ممالک کے رؤساء کے پاس خطوط پہنچانے کے علاوہ مسلم کو دارالحرب میں داخل ہونے کی اجازت نہ دے۔ بالکل اسی طرح جیسے دارالاسلام میں اجنبی کی تجارت کا حکم ہے؛ مسلم پر واجب ہے کہ ممنوعہ اشیاء کی تجارت سے باز رہے نیز سودی کاروبار سے بھی۔ اسی طرح اس پر یہ بھی ضروری ہے کہ تکلیف دہ اور مضرت رساں پودے اور جانوروں کی تجارت نہ کرے۔ دارالحرب میں ایسی اشیاء کی تجارت پر بھی پابندی ہے جو جنگی نقطۂ نظر سے دارالحرب کی تقویت کا باعث ہو۔ بہر حال مسلم اور غیر مسلم کے مابین تعلقات قائم رہنے چاہئیں چاہے دارالاسلام میں قیام کرے یا اپنے گھر میں۔ صاحب البدائع نے کہا کہ وہ مسلمانوں کے شہروں میں سکونت اختیار کریں گے اور خرید وفروخت کریں گے۔ کیوں کہ ذمیوں کے معاہدہ کا آغاز اسی وجہ سے ہوا ہے کہ وہ ان کے اسلام کا ذریعہ بن سکے اور مسلمانوں کے شہروں میں ان کے قیام سے یہ مقصود حاصل ہو سکے۔ اس میں مسلمانوں کے لئے خرید وفروخت کے تعلق سے بھی فائدہ ہے۔

انسانی عقل نے نئی نئی چیزوں مثلاً گفت وشنید اور مفاہمت کے جن سفارتی اصول و قواعد کو ایجاد کیا ہے، اسلام نے انہیں پہلے ہی واضح کر دیا ہے چناں چہ اس وقت سیاست داں سلامتی کے ساتھ زندگی گذارنے کی دعوت دیتے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ سیاسی اور سماجی مذاہب امن وسلامتی کے ساتھ اچھے پڑوسی کی حیثیت سے ایک دوسرے کے شانہ بشانہ چلیں۔ سیاستداں اس کے بارے میں موشگافیاں تو بہت کرتے ہیں لیکن اس کے نتائج بہت ہی کم سامنے آپاتے ہیں۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو اس نے صرف مسلمانوں اور غیر مسلمین کے مابین سلامتی کے ساتھ زندگی گذارنے پر ہی زور نہیں دیا ہے بلکہ اس سے بلند ہو کر ایسے دوستانہ اور بہی خواہانہ طرز زندگی کی طرف بلایا ہے جس کی حدیں سلامتی سے کہیں آگے محبت، شادی اور خونی وقریبی رشتہ داریوں سے جاملتی ہیں۔

دوسری چیز جس میں اسلام سبقت لے گیا ہے، اس کا وہ سماجی پہلو ہے جس کی جدت زمانہ کے باوجود بھی بوسیدہ نہیں ہوسکی۔ چناں چہ اس نے سماجی عہد و پیمان کی ایک ایسی مثال سے دنیا کو روشناس کرایا ہے جو ارتقاء کی عظیم معراج کو پہنچی اور جس سے جدید قانون سازی نے اب واقفیت حاصل کی ہے۔

اہل حیرہ کے نام خالد بن ولید کے خط میں یہ مذکور ہے کہ ''میں نے ان کے لئے یہ قانون بنایا ہے (گفتگو نصاری کے سلسلے میں ہورہی ہے) کہ ایسا بوڑھا شخص جو کام سے عاجز آگیا ہو یا وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہو یا وہ مالدار تھا پھر محتاج ہو گیا ہو اور لوگ اسے صدقہ دینے لگیں تو اس کا جزیہ ختم کر دیا جائے اور جب تک اس کے اور اس کے عیال دار الہجرۃ اور دارالاسلام میں قیام کریں گے، ان کی کفالت مسلمانوں کے مال سے کی جائے لیکن اگر وہ دار الہجرۃ یا دارالاسلام کے علاوہ کہیں چلے گئے تو ان کی کفالت مسلمانوں پر ضروری نہیں''۔

ابو یوسف نے کتاب ''الخراج'' میں لکھا ہے کہ کسی ایسے مسکین سے جزیہ نہیں لیا جائے گا جسے صدقہ دیا جاتا ہو، نہ کسی اندھے سے جس کے پاس نہ کوئی ہنر ہو نہ روزگار، نہ کسی ایسے ذمی سے جسے صدقہ دیا جاتا ہو، نہ اپاہج لوگوں سے۔ لیکن اگر اپاہجوں اور لولوں لنجوں کے لئے کوئی کمانے والا موجود ہو تو اس سے جزیہ لیا جائے گا۔ اندھوں، پادریوں اور کلیسا برداروں کے لئے بھی یہی قانون ہے۔ لیکن اگر وہ مساکین جنہیں ان ہی میں سے کوئی کام کرنے والا صدقہ دیتا ہے تو ان سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔ اس قسم کے اجتماعی عہد و پیمان کا جدید پہلو یہ ہے کہ جدید ممالک صرف اپنے ہم وطنوں کو اس قسم کی ضمانت دیتے ہیں حالاں کہ اسلام ان تمام غیر مسلمین کو سماجی ضمانت دیتا ہے جو کسی مصیبت کی بنا پر کام سے معذور ہوں جیسے اندھے اور لولے لنجے، یا کسی مالی حادثہ کی بنا پر کہ وہ مالداری کے بعد محتاج ہو گیا ہو۔ مسلمان حاکم پر فرض ہے کہ وہ محتاجوں کے امور پر نظر رکھے۔ یا تو اس کا جزیہ معاف کر دے یا بیت المال سے رزق کا ایسا کوئی انتظام کر دے جو اس کے اور اس کے اہل و عیال کے لئے کافی ہو۔

ظلم کے دفاع کے لئے جنگ جائز ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے لئے حملہ میں پہل کرنا ممنوع ہے۔ اسی طرح جب مسلمان ناحق اپنے وطن سے نکالے جائیں یا اللہ تعالی کے عظیم حقوق اور نشانیوں کی پامالی کی جائے یا مسلمانوں کے دینی امور میں فتنہ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے تو جنگ کرنا مباح ہے۔ خود قرآن اس وقت کا تعین کرتا ہے جس میں مسلمانوں پر امن و امان قائم رکھنا واجب ہو جاتا ہے۔ اسی سے مقاصد جنگ کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔ یعنی ظلم و زیادتی اور فتنہ کی بیخ کنی۔ چنانچہ جب جنگ کا جواز اور سبب موجود ہو تو شارع اسلام عملی طور پر اسلامی تعلیمات کے مطابق اور اخلاقی طور پر سچے مسلمان کے شایان شان جنگ کو عملی شکل دینا چاہتا ہے۔

لہٰذا آغاز جنگ سے پہلے اسلام کی دعوت دینا یا معاہدہ طے کرنا ضروری ہے، اور جنگ آخری اقدام ہے، حضرت عطاء بن یسارؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو مبعوث بنا کر بھیجا اور ان سے فرمایا گذر جاؤ، متوجہ مت ہونا، انہوں نے فرمایا یا رسول اللہ! میں ان کے ساتھ کیسا سلوک کروں گا، تو آپ نے فرمایا جب تم ان کے میدان میں اترو تو ان سے جنگ نہ کرو جب تک کہ وہ تم سے جنگ نہ کریں پھر اگر وہ جنگ کریں تو تب بھی اس وقت تک جنگ نہ کرو جب تک وہ تمہارے کسی آدمی کو قتل نہ کر دیں اور اگر تم میں سے کسی کو وہ قتل کر دیں پھر بھی ان سے قتال نہ کرو یہاں تک کہ تم ان کے سامنے مقتول کو پیش نہ کر دو پھر ان سے کہو کیا تم کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ پڑھو گے؟ اگر وہ کہیں ہاں تو ان سے پھر کہنا کیا تم نماز قائم کرو گے اگر وہ اقرار کریں تو ان سے کہنا کیا تم لوگ اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرو گے اگر وہ مان لیں تو اب مزید ان سے کسی چیز کا مطالبہ مت کرنا۔ اللہ کی قسم اگر تمہارے ہاتھ پر کوئی شخص ایمان لے آیا تو یہ ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جن کے درمیان سورج طلوع اور غروب ہوتا ہے۔

مذہب اسلام جنگ سے پہلے اعلان کو واجب سمجھتا ہے اور دھوکہ بازی سے منع کرتا ہے اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے۔ ''و اما تخافن من قوم خيانة فانبذ اليهم على سواء ان الله لا يحب الخائنين'' (سورہ الانفال:۵۹)

''اور اگر تمہیں کسی قوم سے بدعہدی کا خطرہ ہو تو تم بھی اسی طرح ان کا عہد ان پر پھینک مارو۔ بے شک اللہ بدعہدوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔''

مسلمانوں کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ دشمن پر دھوکہ سے حملہ کریں۔ یہ ایک اخلاقی اصول ہے جو خود ساختہ اور دنیاوی آئین میں صرف چند سال پہلے شامل کیا گیا ہے۔ ہیگ (Hague) کانفرنس منعقدہ ۱۹۰۷ء میں یہ قانون مرتب ہوا کہ غیر مشتبہ سابق نوٹس کے بعد ہی

جنگی کاروائیاں شروع کی جائیں اوراس کی دوصورتیں ہیں: یاتو پہلے جنگ کا اعلان ہو چکا ہو جو باعث جنگ ہو یا پھر آخری وارننگ دی گئی ہو جس میں یہ بیان ہو کہ گویا جنگ فریقین کے مابین قائم ہے لیکن اسی وقت جب وہ ملک جسے دھمکی دی جارہی ہے، ان مطالبات کا جواب نہ دے جنہیں دھمکی دینے والے ملک نے قائم کیا ہے۔

جس طرح اسلام نے مریضوں اور زخمیوں کی تیمارداری، دیکھ بھال کو ضروری قرار دیا اور دشمن کو اذیت ناک تکلیف دینے اور دھوکہ سے قتل کرنے سے منع فرمایا اسی طرح اس نے ایسے اصول بھی مقرر کیے جو سفراء اور مذاکرے کرنے والوں کی حفاظت کے ضامن ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو دنیاوی قوانین میں پورے طور پر مرتب نہیں۔ مگر ہاں عرصۂ دراز کے بعد معاہدہ جنیف ۱۸۶۷ء میں کچھ دفعات مقرر ہوئے جس میں علی الترتیب ۱۹۰۶ء اور '' جون ۱۹۲۹ء کے معاہدے میں ترمیم ہوئی، مگر یہ اسلام کے مقرر کردہ اصول کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ طے کیا گیا کہ مریضوں اور زخمیوں کی دیکھ بھال اور حفاظت اس وقت تک ہوتی رہے جب تک کہ نبرد آزما ممالک اس کے بارے میں کوئی دوسرا فیصلہ نہ دیدیں، خواہ اس کا تعلق کسی بھی قوم سے ہو، چونکہ زخمی اور مریض جو دشمن کے قبضہ میں ہیں جنگ کے قیدی شمار ہوتے ہیں۔

اسلام کے قابل فخر معاملات میں معاہدہ کرنا بھی ہے۔ چنانچہ اسلام نے، جو ایفائے عہد کا درس دیتا ہے، لازمی معاہدے کی خصوصیت اور اس کے احترام کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اخیر تک اس کے دفعات کو نافذ کرنے کی صراحت کی ہے چونکہ یہ بھی عقد کی ایک قسم ہے۔ لہذا اس کا احترام بھی عقد کے مانند فریقین کے لئے ضروری ہے، ارشاد ربانی ہے:

''وأوفوا بعهد الله اذا عاهدتم و لا تنقضوا الأيمان بعد توكيدها

و قد جعلتم الله عليكم كفيلا. ان الله يعلم ما تفعلون. ولاتكونو كالتى نقضت غزلها من بعد قوة أنكاثا. تتخذون أيمانكم دخلا بينكم أن تكون أمة هى أربى من أمة"(سورۃ النحل:۹۱:۹۲)

"اور اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو جب کہ تم باندھ چکے ہو، پورا کرو اور قسموں کو، ان کو مؤکد کرنے کے بعد، مت توڑو در آں حالیکہ تم اللہ کو اپنے اوپر گواہ ٹھہرا چکے ہو۔ بے شک اللہ جانتا ہے جو کچھ کرتے ہو۔ اور اس عورت کے مانند نہ بن جاؤ جس نے اپنا سوت خوب مضبوط کاتنے کے بعد تار تار ادھیڑ کے رکھ دیا۔ تم اپنی قسموں کو اس اندیشہ سے آپس کے فساد کا ذریعہ بناتے ہو کہ ایک امت دوسری امت سے کہیں بڑھ نہ جائے۔"

اسلام میں معاہدہ نامہ بالعموم مختصر ہوتا ہے، تفصیلی عبارت نہیں ہوتی۔ جس غرض سے معاہدہ ہو رہا ہے اس کے مطابق مضامین مختلف ہوتے ہیں۔ شروع شروع میں معاہدے دینی اور سیاسی ہوا کرتے تھے۔ لیکن اس کے بعد اقتصادی معاہدے بھی ہونے لگے۔

مسلمانوں کے نزدیک دائمی اور وقتی معاہدہ میں فرق ہے اور یہ فرق معاہدہ کے دفعات یا شق پر منحصر نہیں بلکہ فریق ثانی پر موقوف ہے جس کے ساتھ معاہدہ ہو رہا ہے۔ اگر کسی ذمی سے معاہدہ ہو تو دائمی اور کسی حربی سے ہو تو وقتی اور عارضی ہوگا۔ معاہدہ کی مدت میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ صلح حدیبیہ پر قیاس کرتے ہوئے علماء احناف وشوافع کے نزدیک غیر مسلموں کے ساتھ معاہدہ امن کی مدت دس سال سے زیادہ جائز نہیں اور بعض لوگوں کے نزدیک صلح حدیبیہ چونکہ عملی طور سے اتنی مدت تک باقی نہ رہی لہذا اس پر قیاس کر کے غیر مسلموں سے یہ معاہدہ تین یا چار سال سے زیادہ کے لئے درست نہیں۔ بعض حنبلی علماء کا قول ہے کہ امام مصلحت کے پیش نظر معاہدہ کی مدت دس سال سے زیادہ بھی رکھ سکتا ہے مثلاً جب مسلمان کمزور

پڑ جائیں یا دشمنوں کے ساتھ جنگ جاری رکھنے اور انجام تک پہونچانے سے قاصر ہوں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ معاہدہ کے دائمی اور وقتی ہونے میں امام کی رائے کا اعتبار ہے۔ مسلمانوں کا مفاد اور مصلحت میں جو زیادہ مناسب ہو اسی کا لحاظ کرتے ہوئے امام فیصلہ کرے۔

جب امام کو معاہدہ سے مسلمانوں کے حق میں نقصان نظر آئے تو معاہدہ توڑ کر جنگ شروع کر سکتا ہے بشرطیکہ جنگ کا اعلان کر دیا جائے۔ قرآن کا ارشاد ہے "وأذان من الله ورسوله الى الناس يوم الحج الأكبر أن الله بریء من المشركين ورسوله" (سورة التوبة:٣)

"اور اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے بڑے حج کے دن لوگوں میں منادی کر دی جائے کہ اللہ اور اس کے رسول مشرکوں سے بری الذمہ ہیں"۔

☆☆☆

مسلم علماء نے شرعی سیاست اور شاہی احکام کے نام سے دستوری اور انتظامی آئین پر یا ان ہی جیسے دوسرے موضوعات پر علمی تحقیق کی ہے اور اس عنوان سے بھی بہت سی کتابیں لکھی ہیں مثلاً حنبلی فقیہ امام ابن تیمیہ کی کتاب "السیاسۃ الشریعۃ فی اصلاح الراعی والرعیۃ" ابوالحسن بصری شافعی معروف بہ ماوردی کی کتاب "الاحکام السلطانیۃ" سرفہرست ہے۔

خلافت وحکومت بنیادی طور پر فقہاء کے مباحث میں شامل تھے، مگر جب علم کلام کا دائرہ وسیع ہو گیا اور عقیدہ سے متعلق گفتگو ہونے لگی تو باضابطہ اس پر تحقیق ہونے لگی۔ چنانچہ ابن قتیبہ نے ایک کتاب "الامامۃ والسیاسۃ" کے نام سے لکھی۔

فقہاء کرام نے اپنی کتابوں میں اسلامی سلطنت کے نظام اور اس کے اصول نیز

حاکم کا رعایہ اور اصحاب حل وعقد سے تعلق جیسے عنادین سے بھی تعرض کیا ہے۔

اسی طرح تعزیری قوانین پر فقہاء نے علمی گفتگو کی اور اس کی وضاحت کی کہ جرم کا بوجھ، کسی بے قصور پر نہیں ڈالا جائے گا اور اس نظام کا شیرازہ بکھیر دیا جو زمانۂ جاہلیت میں رائج تھا۔ جرم وسزا پر مباحثے کیے اور وہ جرائم جن کی سزا متعین ہے اور جس کی سزا شارع نے قاضی کی صوابدید پر چھوڑ دی ہے اس کے بارے میں دوٹوک بات کہی۔

حقیقت یہ ہے کہ شریعت اسلامی نے جرم یا سزا کے سلسلے میں نص پر کوئی تعزیری ذمہ داری نہیں ڈالی ہے اور یہ معقول بھی نہیں ہے کہ وہ شریعت جسے ابدیت کا دعوی ہو کسی جرم یا سزا کو قطعی نص کے ذریعہ متعین کردے پھر کہے کہ "کوئی جرم یا سزا بغیر نص کے نہیں ہے"، علما شریعت نے اس باب میں وسعت ذہنی سے کام لیا ہے اور حاکم کو اس کا اختیار دیا ہے کہ وہ نظام کی درستگی اور معاشرہ کی اصلاح کے پیش نظر جو مناسب سمجھے متعین کرے، قرآن کریم نے ایسے تمام جرائم کی وضاحت کی ہے جس کا عام نظام پر برا اثر پڑ سکتا ہے اور اس کے لئے واضح سزائیں بھی تجویز کی ہے۔ یہ جرائم مال، جان، عزت و آبرو اور دین و مذہب، حسب ونسب، عقل اور نظام عام سے جڑے ہوئے ہیں۔

جہاں تک خاص قانون کا تعلق ہے خواہ وہ خاص بین الاقوامی قانون ہو جو رہائش سے متعلق ہو یا شہریت یا ملک میں غیر ملکیوں کے مراکز وقوانین کے اختلافات کے متعلق ہوں، یا ایسے قوانین جو باہمی تعلقات اور افراد و جماعت کے مالی تصرفات کو منظم کریں جس کو اصطلاحاً شہری قانون کا نام دیا گیا ہے اور اس سے متعلق تجارتی اور سمندری قانون ہو یا دو گروہوں کے درمیان فیصلہ کرانے والی ہوں جو خواہ افراد کا معاملہ ملک کے ساتھ ہو یا اس کے برعکس ہو، ان تمام کی فقہا نے بڑی وسعت ذہنی اور فراخدلی کے ساتھ اپنایا ہے اور اس میں ایسے شرعی

نظریات کی تخلیق کی ہے جو حوصلہ افزائی کے قابل ہیں۔ اس سلسلے میں قانونی کلچر و تمدن نے جو ترقی آج کی ہے اس کی بلندی تک فقہ اسلامی ہزار سال پہلے پہنچ چکی ہے.

فقہاء اسلامی نے بہت پہلے حقوق، اموال، ملکیت اور طریقہ تملیک بیان کر دیے ہیں اور ہر چیز میں ملکیت تام، ملکیت ناقص اور اسباب ملکیت پر کلام کیا ہے۔ ان لوگوں نے نفع بخش ملکیت اور حق انتفاع کے درمیان فرق بیان کیا ہے اور عہد و پیان کا بغور مطالعہ کیا ہے، اور معاوضہ، کفالت، قرض اور حق کی ادائیگی کا تعارف کرایا ہے جیسا کہ انہوں نے شخصیت کو اس کی اہلیت کے پہلو سے موضوع بحث بنایا ہے اور وجوب واداء کی اہلیت کے درمیان فرق بیان کیا ہے۔ ذمی اور قانونی شخص کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ جس طرح اہلیت کے شرائط اور عقود میں رضامندی کے عیوب سے بحث کی ہے۔ انہوں نے بدحالی اور تنگ دستی کے درمیان فرق بیان کیا ہے۔ وکالت عام، وکالت خاص، وکالت مطلق اور وکالت مقید کی وضاحت کی ہے، اسی طرح ولایت ذاتی اور ولایت متعدی کو بھی بیان کیا ہے۔ خواہ وہ ولایت جان کی ہو یا مال کی، لایعنی چیزوں اور اس کے تصرفات کا حکم بیان کیا ہے جیسے انہوں نے تضمین کو موضوع بحث بنایا ہے۔ قانونی اصطلاح میں یہ وہ چیز ہے جو شہری ذمہ داری کے برابر ہوتی ہے۔ معاوضہ کو مسلمان فقہا نے دو قسموں میں بانٹا ہے۔

(۱) وہ معاوضہ جس پر نص قطعی ہو جیسے دیت (خوں بہا)

(۲) ایسا معاوضہ جس پر نص قطعی نہ ہو۔ حاکم خود اپنے انداز سے، یا اپنے تجربہ کار نائبین کے ذریعہ متعین کرے، مثلاً مالی یا بدنی نقصان کی قیمتیں، جس کا شریعت میں کوئی تخمینہ نہیں لگایا گیا ہے اور اسے حکومت العدل کہا جاتا ہے۔ فقہا نے ایسی ذمہ داری کا انکار کیا ہے جس میں نہ کوئی نقصان ہو اور نہ دوسرے کی حق تلفی ہو۔

وہ نقصان جس پہ فقہ اسلامی میں شہری ذمے داری عائد ہوتی ہے، وہ ہے جو انسان کی جان و مال، شرافت و کرامت یا شہرت وعظمت کو لاحق ہوتا ہے مثلاً کسی عضو اور مال کا نقصان یا اس پر تہمت لگانا وغیرہ وغیرہ۔

ابتداء اسلام سے ہی قضاء کا رواج عام رہا ہے چنانچہ خود رسول اکرم ﷺ نے بہ نفس نفیس اسے مدینہ میں رائج کیا تا کہ جھگڑوں کا فیصلہ کیا جا سکے اور اللہ کے پیغام کو انسان تک پہونچا دیا جائے۔ آپ ﷺ کے نزدیک اثبات کا طریقہ دلیل، قسمیں، گواہوں کی گواہی، تحریر نامہ، فراست ایمانی اور قرعہ اندازی وغیرہ تھا۔ رسول ﷺ فرمایا کرتے تھے: مدعی کے لئے دلیل پیش کرنا ضروری ہے اور منکر کے لئے حلف لینا۔ شریعت میں بینہ اس چیز کو کہتے ہیں جو حق کو واضح اور ظاہر کر دے یعنی مدعی کو ایسے گواہ لانا ضروری ہے جو اس کے دعوے کو واضح کر دیں چنانچہ جب کسی طرح سے اس کا صدق ظاہر ہو جائے تو اس کے حق میں فیصلہ دیا جائے گا لہذا حاکم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسی طرح فیصلہ کرے جس طرح حق ظاہر ہو اور جہاں تک باطن کا تعلق ہے تو اس کا ذمہ دار اللہ تعالیٰ ہے۔

جب اسلام عام ہو گیا تو رسول ﷺ نے اپنے بعض صحابیوں کو قضاء پر مامور کیا چنانچہ علیؓ کو یمن بھیجا تا کہ یمنیوں کے درمیان فیصلہ کا کام انجام دیں اور ان سے کہا ''جب تمہارے سامنے دو فریق بیٹھیں تو ایک کے حق میں اس وقت تک فیصلہ مت دینا جب تک دوسرے کی بات نہ سن لو جس طرح پہلے کی بات سنی تا کہ فیصلہ کھل کر سامنے آجائے'' بیان کیا جاتا ہے کہ علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک معاملہ پیش کیا گیا تو انہوں نے فرمایا ''میں تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہوں اگر تم مان جاؤ تو وہ فیصلہ ہے ورنہ ہم تمہیں روکے رکھیں گے تا آنکہ تم رسول ﷺ کے پاس جاؤ'' تو جب فیصلہ سنایا گیا تو ان لوگوں نے نہیں مانا اور رسول اللہ کے

پاس ایام حج میں آئے اور سارا واقعہ آپ ﷺ کے سامنے بیان کیا تو رسول ﷺ نے علی رضی اللہ عنہ کے فیصلے کو صحیح قرار دیا اور کہا کہ "فیصلہ وہی ہے جو انہوں نے تمہیں سنایا ہے"۔

حضرت علیؓ کا قول، یہ کہ "اگر تم مان جاؤ تو وہ فیصلہ ہے ورنہ ہم تمہیں روکے رکھیں گے" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جرح و تعدیل کے احکام میں ان کے یہاں یہی معروف تھا اور اسی پر عمل کیا جاتا تھا چناں چہ جو کچھ پیش آیا وہ سلطان اعلی کے سامنے از سر نو حکم شروع کرنے کے مشابہ ہے،، جیسا کہ حضرت علیؓ کے قول " تا آنکہ تم رسول اللہ ﷺ کے پاس جاؤ اور وہ تمہارے درمیان فیصلہ کریں" سے پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے ان کو رسول ﷺ کے پاس بھیجا اس لیے نہیں کہ وہ مسلمانوں کے حاکم یا مشرع تھے بلکہ اس لیے کہ اس وقت ان کی حیثیت قاضی کی تھی۔

عمر بن خطابؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسلامی ممالک میں قضاۃ متعین کئے۔ ان کے لئے انہوں نے قضاء کے دستور تیار کئے۔ قضاۃ احکام و معاملات میں اسی سے رہ نمائی حاصل کرتے۔ اس دستور کو معاملات قضاء میں اساسی حیثیت حاصل ہے۔ اس دستور کو ابو موسی اشعری کے پاس بھیجا گیا۔ جس کا متن ہے کہ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اللہ کے بندے عمر امیر المومنین کی جانب سے عبداللہ بن قیس کی طرف، اللہ کی سلامتی آپ پر ہو، حمد و ثناء کے بعد، قضاء ایک محکم فریضہ ہے اور رائج سنت ہے جب کوئی معاملہ تمہارے سامنے پیش کیا جائے تو اچھی طرح سمجھ لیا کرو کیوں کہ حق کے ساتھ کوئی بات بولنا اس وقت تک نفع بخش نہیں ہو سکتا جب تک اس کا نفاذ نہ ہو۔ اپنی مجلس اور اپنے فیصلہ میں لوگوں کے درمیان برابری کا معاملہ کرو تا کہ شرفاء تم سے ظلم کی توقع نہ کر سکیں۔ کوئی کمزور ناتواں تمہارے عدل وانصاف سے مایوس نہ ہو۔ دلیل لانا مدعی کا کام ہے اور قسم کھانا منکر پر لازم ہے۔ مسلمانوں کے درمیان صلح جائز ہے

سوائے ایسی صلح کے جو حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر دے اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ کل تم نے جو فیصلہ دیا تھا اس سے آج رجوع کر لو اور حق کی ہدایت پالو کیونکہ حق قدیم ہے اور باطل پر اصرار کرنے سے حق کی طرف رجوع کر لینا زیادہ بہتر ہے۔ وہ امور جو کتاب وسنت میں نہیں ہیں ان کے سلسلے میں اگر تمہارے دل میں تردد وتذبذب پیدا ہو تو اچھی طرح غور وفکر کر لو۔ تم ان جیسے مسائل اور مثالوں کو دیکھو اور معاملہ کو اسی پر قیاس کر لو اور مدعی کے لیے غائبانہ حق یاد لیل موجل مقرر کرو جو وہ پیش کر سکے۔ اگر دلیل لے آئے تو اس کے حق میں فیصلہ دے دو ورنہ اس کے خلاف فیصلہ کرو کیوں کہ یہ ناواقفیت کے لیے زیادہ واضح اور بہتر ہے اور عذر کرنا زیادہ مناسب ہے۔

سارے مسلمان عادل ہیں سوائے ان کے جن کو حد جاری ہونے کی بنا پر کوڑے لگائے گئے ہوں یا ان پر جھوٹی گواہی کا تجربہ ہو چکا ہو یا ولاء اور قرابت داری کے الزام میں تہمت لگائی گئی ہو۔ اللہ سبحانہ وتعالی تمہارے اسرار ورموز کو جانتا ہے۔ وہ دلیلوں کے ذریعہ تم سے عفو ودرگذر کا معاملہ کرے گا۔ لوگوں کو پریشانی میں مبتلا کرنے، انہیں ڈانٹنے پھٹکارنے، تکلیف پہنچانے اور ایسے حق کے معاملات میں جھگڑنے سے بچو جن پر اللہ نے اجر واجب کر دیا ہے اور جن پر فخر کرنا بھلا محسوس ہوتا ہے۔ اللہ اور اس کے درمیان کسی معاملہ میں اگر کسی کی نیت درست ہے گرچہ وہ اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو تو اللہ تعالی اس کے معاملات کی چشم پوشی کرے گا اور جو شخص لوگوں کے سامنے ایسی چیزوں کا اظہار کرے گا جس کے برخلاف اللہ تعالی جانتا ہے تو اللہ تعالی اس کو رسوا کر دے گا۔

جب اسلامی ریاست کا رقبہ وسیع ہوا اور جھگڑے کی کثرت ہوئی تو کچھ قاضی مختلف قسم کے مسائل کی نگرانی کے لیے متعین کیے گئے۔ اسی طرح ہر علاقہ کے لیے ایک قاضی متعین

کیا گیا جو زمان و مکان کے حساب سے فیصلہ کرتا اور اس میں زیادتی نہیں کرتا۔ اسی طرح اسلامی فقہ عدالت کے نظریہ سے بھی واقف ہوا اور مختلف شہروں میں ایک خاص جگہ عدالت بنائی گئی جس میں ہفتہ کے کسی خاص دن قاضی آتا اور فیصلہ کرتا۔ فقہ اسلامی جزئی اور کلی قضاء سے بھی واقف ہوتی رہی۔

اسلامی فقہ عدلیہ کے نظام سے بھی متعارف ہوئی۔ فقہاء نے فیصلہ کے لیے قاضی کی صفات متعین کیں۔ اسی طرح عام نیابت، نظم ونسق کے نظام، ادارتی قضاء کے عدلیہ اور فتاوی کے اقسام سے بھی واقفیت ہوتی رہی۔ ان کا نام "ولایۃ حسبۃ"، "ولایۃ مظالم وافتاء" رکھا گیا۔

جہاں تک مال اور ملکیت اور اجتماعی نظام کے پہلو کا مسئلہ ہے تو فقہاء نے انتہائی تفصیل کے ساتھ ملکیت، مال کے ذرائع، اس کے مصارف اور ان قیود سے بھی بحث کی جسے شارع نے مالکین پر محتاجوں کے تعلق سے کچھ واجبات بھی لازم کیے جو بطور احسان نہیں بلکہ اخوت انسانی اور اجتماعی تعاون کی بنیاد پر ان کے مال میں فرض کی حیثیت رکھتے ہیں۔

فقہا نے زکوۃ، عشر، خراج اور اموال کے ذخیرہ کے متعلق اپنی کتابوں اور مقالات میں کافی بحثیں کی ہیں۔ مثلاً ابو عبید القاسم بن سلام نے "اموال" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ اسی طرح قاضی ابو یوسف اور یحییٰ بن آدم قریشی نے بھی "الخراج" نامی کتابیں تحریر کیں۔

اقتصادی اور مالی پہلو سے بھی اسلام میں سماجی انصاف کے لیے قواعد وضوابط وضع کیے گئے جس سے سرمایہ کاری کی آزادی اور اس کی ملکیت کے حدود واضح ہو گئے۔ اسلام نے کمزور اور محتاج کے دین و مذہب سے قطع نظر ان کی ضرورت کو پوری کرنے کی بھی وکالت کی۔ اسلام کی روشنی میں سماجی مساوات کی ایک حد مقرر ہے۔ جس کی اسلام نے دعوت دی ہے اور

اس کے قواعد وضع کیے ہیں۔ فقہ اسلامی مالی پہلو ہی پر محیط نہیں بلکہ ہر پہلو میں سماجی مساوات کا علم بردار ہے۔

ہ. ج. ویلس (H.J. Wells) ''صانعو التاریخ'' نامی کتاب میں لکھتے ہیں کہ عقیدے اور طبقے کو نظر انداز کرتے ہوئے اسلام نے لوگوں کے درمیان مساوات پر کافی زور دیا ہے۔ عملی طور سے اسلامی اخوت کو بھی نافذ کیا۔ ہماری جدید دنیا میں اسی چیز نے اسلام کو سب سے بڑی موثر طاقت بنا دیا۔

مسلمانوں کے تمام معاملات اسلامی قانون کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ اس قانونی ارتقاء میں آنے والی نسلوں نے بھی حصہ لیا۔ اسلام مسلسل ترقی کرتا رہا یہاں تک کہ یہ ایک عالی شان محل کی شکل اختیار کر گیا جس کی بنیاد اتنی ٹھوس اور مضبوط ہے کہ آنے والی ہر چیز کو برداشت کر سکتا ہے۔ الحمدللہ یہ دین انسانی تعلقات کے لیے ایک منظم قانون بن چکا ہے۔ انسانیت کو خوش رکھنے کی تعلیم دینے اور سماج میں ہر فرد کے لیے بہترین زندگی گذارنے کا ضامن بن گیا ہے۔

''چیمبر'' (Chamber) دائرہ معارف کے مطابق عظمت عقل کی نقاب کشائی کرنے والی اسلامی تعلیمات میں سب سے زیادہ اہم تعلیم قرآنی نظام اخلاق ہے جو ایک سورہ، یا دو سورہ اور ۳ سورہ پر ہی منحصر نہیں ہے بلکہ یہ اخلاقی تعلیم پورے قرآن میں سونے کے دھاگے کی مانند بکھری ہوئی ہے جسے بنے ہوئے کپڑے میں پرو دیا گیا ہو۔ قرآن نے ظلم، جھوٹ، گھمنڈ، کینہ، چغلی، دوسروں کا مذاق اڑانا، کنجوسی، اسراف، فسق و فجور اور شکوک وشبہات کو اوصاف رذیلہ میں شمار کیا ہے۔ جن سے اللہ خوش نہیں ہوتا اور جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے، وہ احسان، فیاضی، حیا، تحمل، صبر، اعتدال، اخلاص، صبر و استقامت، حق سے محبت، سلامتی، ایک

اللہ پر ایمان اور اس کے لیے خشوع وخضوع ہیں جن کو اوصاف حسنہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ تمام صفات صاف ستھری زندگی کے ستون ہیں اور ان ہی سے سچے مومن کا امتیاز قائم ہوتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کا نظریۂ حکومت بالکل واضح اور نمایاں ہے۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ جب مکہ میں قریش نے مسلمانوں کو اذیت پہنچائی تو رسول ﷺ کو یقین ہو گیا کہ ہجرت کے واقعہ میں دعوت اسلام کی حمایت کے لیے اقتدار کا ہونا ناگزیر ہے کیونکہ حق اور آزادی اقتدار اور نظام حکومت کے سائے میں پرورش پاتے ہیں۔ احکام الٰہی کا نفاذ حکمرانی کے بغیر نہیں ہوسکتا ہے۔ چناں چہ حضرت عثمانؓ بن عفان کے مطابق جن چیزوں کو اللہ قرآن سے نہیں روکتا انہیں حکمراں کے ذریعہ روکتا ہے۔

اسلام میں دعوت دین اور قیام حکومت کے درمیان چولی دامن کا رشتہ ہے۔ اسلام صرف عبادت کا دین نہیں ہے بلکہ وہ دین کے ساتھ ساتھ ایک حکومت بھی ہے۔ اسلام کے احکام، زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہیں اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے ضامن تمام نظاموں میں سب سے زیادہ کامل ہیں۔ قانون سازی کے نصوص مجمل طور سے بیان کیے گئے ہیں جو کلی اور اساسی نکات سے بحث کرتے ہیں تاکہ مجتہدین ان سے جزئیات کے احکام مستنبط کرسکیں نیز مصلحت عامہ اور عصر حاضر کا لحاظ رکھتے ہوئے اسلامی احکام وقواعد کی روشنی میں فیصلہ کرسکیں۔

اسلامی فقہ کے احکام اپنے منبع ومصدر کے توسع کی بنا پر اسلامی مملکت کی بنیاد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے مشرق کے بلاد چین سے لے کر مغرب کے بحر محیط تک اور مغربی یورپ کے بڑے حصہ اور شمالی افریقہ کے تمام بڑے ممالک میں حکومت کی۔ جسے تاریخ نے جانا اور اسے اعتبار بخشا۔ فقہ اسلامی نے اسلامی حکومت کو ایک مثالی حکومت بنا دیا اور اسے ایک ایسے

منارۂ نور کی حیثیت دی جس کی تہذیب کی شعاعیں نہ صرف چہاردانگ عالم میں پھیل گئیں بلکہ وہ بہت سی دوسری تہذیبوں اور نظاموں کے لئے منبع اور اساس بن گئی۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اسلامی قانون سازی کی تعلیم، انصاف اور مساوات پر قائم ہے۔ اس نے اپنے تمام احکام میں انسانوں کی عقل کو ہی خطاب کیا ہے۔

ثقافت اسلامی ماضی اور مستقبل میں

عالمی ثقافت کے لئے اسلامی ثقافت کی تاثیر وتاثر اور اس کے گزشتہ ثقافتوں کو محفوظ رکھنے کا مختصر جائزہ لینے کے بعد آپ نے دیکھا کہ اس علمی بیداری کا ظہور پہلی صدی ہجری گزرنے کے بعد صحرانشینوں کے درمیان اس وقت ہوا جب اسلامی تعلیمات لوگوں کے دلوں میں گھر کر چکی تھیں اور اس کا اثر ورسوخ قائم ہو گیا تھا۔ اسی وقت اسلامی علوم ومعارف کی کرنیں پھوٹیں اور اسلامی وعربی علوم وفنون اپنی مختلف انواع واقسام کے ساتھ ابھر کر سامنے آئے چناں چہ انتہائی مختصر سی مدت میں نہ صرف پوری دنیا پر چھا گئے بلکہ ایسی عالمی ثقافت کی شکل اختیار کر گئے جو ہر میدان اور فن کے محقق کی رہنمائی اور علمی ومعاشرتی بیداری کی بنیاد قرار پائی۔

پرنستون (Princeton) یونیورسٹی میں مشرقی علوم کے صدر شعبہ، مستشرق کویلر یونج (Koehler Yong) مغرب پر اسلامی اثرات کے متعلق کہتے ہیں: ''آٹھویں صدی عیسوی کے درمیان جب عالم اسلام کا دار السلطنت بغداد منتقل ہوا تو فتح کا زمانہ ختم ہو گیا۔ چین کی سرحدوں سے لے کر ہرقل روم کی سرزمین تک اسی زبان، قانون اور دین کی حکمرانی قائم ہو گئی جسے قرآن کریم نے پیش کیا تھا۔ عباسیوں کے پانچ سو سالہ دور حکومت میں اسلام کا فکری نظام اور اس کی ہمہ گیر ثقافت کافی پروان چڑھ گئی جس کی بنیاد نویں اور دسویں صدی میں قدیم علوم و

فنون کے احیاء پر تھی جسے مشرق کا نشأۃ ثانیہ کہا جاتا ہے"[1]

ان دونوں صدیوں اور اس کے بعد کی صدی میں اسلامی ثقافت اپنی بلندی کو پہنچ گئی تھی اور رونما ہونے والی ثقافتی بیداری نے بارہویں اور تیرہویں صدیوں کے درمیان لاطینی دنیا میں اپنے قدم جما دیے اور عہد وسطی کی مسیحی تہذیب کا ایک جزء بن گئی اور پندرہویں اور سولھویں صدی میں یہی چیز مغرب کی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد بنی۔

گستاؤلیبان (Gustave Le Bon) کہتے ہیں[2] کہ اسلامی تہذیب نے دنیا پر بہت گہرا اثر چھوڑا۔ یہ مسلمانوں کے ثقافتی اثرات کا ہی نتیجہ تھا کہ یورپ کے سامنے سائنسی، ادبی اور فلسفیانہ علوم وفنون کے دروازے کھلے چناں چہ تقریباً چھ صدیوں تک علمی طور پر وہ ہمارے محسن بھی رہے اور قائد بھی۔

یہ مسلمان ہی ہیں جن کے درمیان علوم وفنون کے چشمے پھوٹے۔ انھوں نے ہی سب سے پہلے رسول اکرم کے قول (الحکمة ضالة المؤمن یلتقطها حیث وجدها) پر عمل کرتے ہوئے مختلف ثقافتوں کو اعلی اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھال کر ان کی حفاظت کی اور انھیں رواج بخشا۔ مسلمانوں میں نہ تو جمود وتعطل تھا اور نہ ہی پس ماندگی بلکہ قوت نفس، عزم واستقلال کی پختگی، پختہ دلی اور اسلامی تربیت وہ عناصر تھے جنھوں نے انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ہر بہترین چیز کو قبول کریں اور مختلف علوم وفنون اور ثقافتوں سے آشنا ہوں تا کہ روئے زمین پر اللہ کی خلافت کو نافذ کریں اور اس کے حکم کے مطابق اسے عدل و انصاف سے بھر سکیں۔ (هو انشاكم من الارض و استعمركم فيها) (سورة

1- الثقافة الاسلامية والحياة المعاصرة، تدوین: محمد خلف اللہ، قاہرہ، ۱۹۵۰ء، ص ۲۳۲-۲۵۸

2- گستاؤلیبان (Gustave Le Bon): حضارۃ العرب، ص ۵۷۹

ھود:٦١) ۔ ’’اسی نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور اس میں آباد کیا‘‘۔

مسلمان جس وقت علوم وفنون اور تہذیب وثقافت کے ان میدانوں کو سر کر چکے تھے، دوسرے لوگ خواب خرگوش میں مست اور جہالت کی تاریکی میں بھٹکتے پھر رہے تھے یہاں تک کہ جب نفس انسانی میں پوشیدہ حصول معرفت کے تقاضے کے مطابق ان لوگوں نے اپنی آنکھیں کھولیں تو انھیں اسلامی علوم و معارف کے سوا روشنی حاصل کرنے کا کوئی دوسرا ماخذ اور ذریعہ نظر نہیں آیا۔ ان علوم و معارف میں سے بعض تو اسلام کے عطا کیے ہوئے تھے اور بعض کی طرف اس نے رہ نمائی کی تھی تا کہ وہ اسلامی تعلیمات کو روئے زمین پر نافذ کر سکیں اور دنیا کی ان تمام چیزوں سے مستفید ہو سکیں جس میں انسانیت کی خیر و برکت اور اس کی صلاح وفلاح مضمر ہو۔

پروفیسر فیشر (Fischer) کہتے ہیں کہ انتہائی قدیم اور عظیم رومانی تہذیب کے دوران مسلم فاتحین کے ذریعہ دمشق، قاہرہ اور بغداد سے فکر کی چمکدار کرنیں پھوٹ پڑیں اور مغرب اور مشرق کے تعلقات منقطع ہونے کے بعد ایک بار پھر یورپی اور مشرقی علوم وفنون کے راستے کھل گئے۔ عربوں کی قوت کا راز یہ تھا کہ وہ عنصریت (نسلی یا لسانی عنصر) پر نہیں بلکہ مذہب پر مبنی تھی۔ مسلم فاتحین نے عنصریت کی طرف کبھی توجہ نہیں دی۔ نہ اسے اپنا ہدف بنایا چنانچہ ان لوگوں نے اسپین میں شادیاں رچائیں، بیزنطینی فنکاروں اور صنعت کاروں سے بلا جھجک خدمات حاصل کیں۔ اسی طرح کاشتکاری میں مقامی کسانوں پر پورا اعتماد کیا۔[1]

یہ سب اس وقت تھا جب امت مسلمہ ایک مضبوط، نوخیز، متحد، بیدار اور زندہ تھی۔ اس کا کام صرف نبی کریم ﷺ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا اور صحیح اصولوں کے مطابق

۱- فیشر (Fischer): تاریخ اُوربانی العصور الوسطی، ترجمہ محمد مصطفیٰ زیادہ، ج ۲، ص ۳۹۵

اسلامی دعوت کی پیروی کرنی تھی۔ اس نے اس دین کو محض ذکر ودعا، تلاوت اور تعویذوں کے بندھن میں باندھ کر نہیں رکھا تھا۔ لیکن جب مسلمانوں نے ان اعلیٰ اصولوں کو چھوڑ دیا اور اسلام کی معنوی خوبیوں سے ان کے رابطے منقطع ہونے لگے تو ان کا اتحاد ٹوٹنے لگا، ان کا دبدبہ کمزور پڑنے لگا اور وہ زوال کا شکار ہو گئے۔ چنانچہ اسٹریا کے مسلم مفکر محمد اسد مسلمانوں کے اس پسماندگی کو اپنی کتاب ''اسلام ایک موڑ پر'' میں اس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ حقیقت میں آج اسلامی زندگی جس صورت حال میں ہے وہ ان مثالی نمونوں سے کوسوں دور ہے جنھیں اسلامی تعلیمات پیش کرتی ہے۔ چنانچہ اسلام کی ترقی اور چستی آج مسلمانوں میں پس ماندگی اور جمود کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

مزید کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے اس معاشرتی اور ثقافتی زوال کا صرف ایک ہی سبب ہے جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ مسلمانوں نے رفتہ رفتہ اسلامی تعلیمات کی روح کی اتباع ترک کر دی، اس کے بعد اسلام موجود تو رہا لیکن ایک بے روح جسم کی مانند۔ چنانچہ جب ہم نے اپنے دین حق کو چھوڑ دیا تو ہم پچھڑنے لگے اور کمزور ہونے لگے۔

ہم از سر نو اپنی قوتوں کو استعمال کر سکتے ہیں۔ ہمارے اسلامی ممالک دنیا کے مرکز میں واقع ہیں بلکہ اس کے دل کی مانند ہیں۔ ہمارے پاس وہ ذرائع ہیں جن سے تہذیبیں بنتی ہیں۔ ان رکاوٹوں کے باوجود جن کی وجہ سے مسلمان پس ماندگی کا شکار ہوئے، ہمارا دین روحانی اور مادی دونوں اعتبار سے، اب تک کی سب سے بڑی قوت ثابت ہوا ہے۔ مسلمانوں کے پاس اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی قدروں کا پورا ایک ذخیرہ ہے چناں چہ اگر مسلمان اپنی زندگی کی اصلاح، اس کی تنظیم نو اور اتحاد واتفاق کے سلسلے میں اپنے اسلاف کے نقش قدم پر ان اصولوں سے فائدہ اٹھائیں تو وہ انسانیت کو خیر و بھلائی کی راہ دکھانے میں موثر کردار ادا کر سکتے

ہیں۔ استحصال اور برائیوں کے ان تمام عوامل کا منہ توڑ جواب دے سکتے ہیں جو نہ صرف امن وسلامتی کے لئے خطرہ بن جاتے ہیں بلکہ اس سے بین الاقوامی تعلقات بھی خراب ہوتے ہیں اور دنیا تباہی و بربادی کے دہانے پر پہنچ جاتی ہے۔

دنیا کی بڑی بڑی قوموں نے علمی اور مادی میدان میں حیرت انگیز ترقی کی ہے اور قہر وفساد اور قبضہ وملکیت کے ان طریقوں پر قادر ہو گئیں، شر وفساد جس کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں۔ موجودہ عالمی ثقافت کی خرابی یہ ہے کہ یہ ایک مادی علمی ثقافت ہے جس میں علم نے تو ترقی کی لیکن ثقافت کو زوال آ گیا اور بالآخر انسان کے ہاتھ سے اس کی لگام چھوٹ گئی۔ اس میں روحانیت اور اخلاقی قدروں کو داخل کرنے کی ساری کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ بعض مغربی مفکروں نے یہ خطرہ محسوس کیا اور کہا کہ اگر مغرب اپنی روحانی وثقافتی اور سائنسی ترقی میں توازن نہ قائم رکھ سکا تو اس کا زوال یقینی ہے۔ چنانچہ جرمن فلسفی اسپنگلر (Spengler) اپنی کتاب مغرب کا زوال میں کہتا ہے کہ یورپی تہذیب میں روحانیت پر مادیت کا غلبہ ہو چکا ہے اور یہ سب ظاہر میں نظر آنے والی مادی اور عمرانی ترقی کے باوجود اس تہذیب کے زوال کا آغاز ہے۔

وہ آگے کہتا ہے کہ موجودہ تہذیب جس مرحلہ سے گزر رہی ہے وہ گمراہ کن تمدن کا ایک ایسا مظہر ہے جو اپنی چمک دمک کے ذریعہ روحانی تشنگی پر پردہ ڈالتا ہے۔ یہ تہذیب تیز رفتاری سے پچھلی تہذیب کے مانند رو بہ زوال ہے۔ یہی خدائے تعالی کا طریقہ کار ہے جسے کوئی روک نہیں سکتا۔

آگے مزید لکھتا ہے کہ تہذیب فلکیاتی نظام کی مانند ہے۔ وہ دوسری طرف سے طلوع ہونے کے لئے ہی غروب ہوتی ہے۔ ایک نئی تہذیب بہترین شکل وصورت میں بس

طلوع ہونے کے قریب ہے۔ یہ تہذیب اس مذہب اسلام کی تہذیب ہے جو آج صاف وشفاف اور عالمی پیمانے کی روحانی قوتوں کی مالک ہے۔

یورپی مکتبہ فکر پر غور کرنے والے شخص کی نظر کتابوں کے ایک ایسے سلسلے پر ضرور پڑے گی جو یورپ کی اس تہذیب پر آنسو بہا رہی ہیں جو خود اپنی صنعتوں اور کارخانوں سے پھوٹنے والے شعلوں میں ڈوب چکی ہے۔ ان کے دل اس خوف سے نوحہ خواں ہیں کہ مبادا یہ تہذیب خاک میں نہ مل جائے کیوں کہ انہوں نے الحاد وکفر کی روش اختیار کی اور اپنے خالق ومالک اور رب حقیقی سے دور ہو گئے

مسلمان ہی انسانیت کو ضلالت وگمراہی سے نجات دلا سکتے ہیں۔ آج وہی اپنے منفرد عقیدے کے ذریعے دم توڑتی ہوئی انسانیت کو شر وفساد کی جگہ امن وسلامتی کی نعمت سے بہرہ مند کر سکتے ہیں۔ اور یہ فضل صرف اسی کو ملے گا جو اللہ کی رضا مندی کے مطابق چلے گا اور حق وصداقت، عدل وانصاف اور سلامتی پر قائم ودائم رہے گا۔

جرح وتعدیل

زندگیاں تابعین کی

طبِ نبوی

فقہِ اسلامی

مکتبہ قاسم العلوم
رحمان مارکیٹ' غزنی سٹریٹ' اُردو بازار لاہور۔
فون: 7231119 42 92+ موبائل: 4021415 321 92+